www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2018

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب و غریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

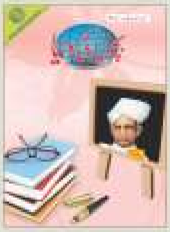

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

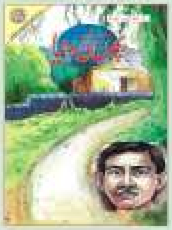

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے | جلد: 2 شمارہ: 7 جولائی 2018 | صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں
نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

مکالمہ — اداریہ — مدیر

روبرو
اصلی لڑائی تو گھر کے اندر کی ہے......حقانی القاسمی 5

نکہت سخن
شاعرات کے منتخب اشعار 8

جہانِ نسواں
ڈاکٹر حلیمہ فردوس...... — سید اسرار الحق سبیلی 9
تحریک نسواں اور چند اردو ناول — ناز آفرین 12
پنچایتوں میں خواتین کا کردار — ایم۔ اے کنول جعفری 17
ایک عرب خاتون کا سفرنامۂ ہند — زرنگار 22
سانس کی طرح چلے منزل ہستی...... — جویریہ قاضی 25
اردو شاعری کی اہم سمتیں — تسنیم بانو 27

کہانیاں
کرپا — رینو بہل 33
دلاری — نسرین بیگم (علیگ) 37
محبت — رخشندہ روحی مہدی 39
غفلت میں جینے والو...... — احساس نایاب 41
ہاتھ جلے گھر کے چراغ سے — سیدہ تبسم منظور ناڈکر 44
مجازی خدا — ضیاء الحسن 48
سرخاب فاطمہ — رونق جمال 51

حسن سخن
شبنم عشائی 52، بشریٰ ہاشمی 52، محمد ارشاد 53 صدف اقبال 53
بیگم لکھنوی 54، اندرا ورما 54

باورچی خانہ 55
لذیذ پکوان

صحت
بریسٹ کینسر — انصاری بانو زبیر احمد 57

آرائش وزیبائش
ایلوویرا قدرت کا ایک انمول تحفہ 59
تاثرات: نگر نگر سے 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقامِ اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

موجودہ معاشرے کے منظرنامے میں جو چیز دل کو خون خون کردینے والی ہے وہ ہے روز بروز بڑھتا تشدد۔ یوں تو ہم انسانوں نے ترقی کی اتنی منازل طے کرلی ہیں کہ اب فطرت کے سربستہ راز سے ہر روز نئے پردے اٹھ رہے ہیں اور ہماری آنکھیں حیرت و استعجاب سے خیرہ ہو رہی ہیں۔ سائنس کی ترقی نے زمین سے اوپر اٹھ کر خلاؤں تک کو اپنا مرکزِ نگاہ بنا رکھا ہے اور وہاں ہونے والی نت نئی تبدیلیوں پر ہر لحظہ ہماری نظر ہے۔ لیکن پتہ نہیں ہم کیوں یہ نہیں دیکھ پا رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں انسان اور انسانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ عدم برداشت کا عالم یہ ہے کہ ہر شخص بلا شرکت غیر ہر طرح کے وسائل پر اکیلے قابض ہونا چاہتا ہے۔ ہم جو سوچتے اور سمجھتے ہیں ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے آس پاس کے تمام لوگ وہی سوچیں اور وہی سمجھیں اور یہ صرف خواہش تک محدود نہیں بلکہ ہمارا پورا زور یہ ہوتا ہے کہ 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' اور اس سے سرمو انحراف کرنے والے کو یہ حق نہیں کہ وہ زندہ رہے۔ یہ رجحان بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے اور اس سے سب سے زیادہ نقصان معاشرتی ڈھانچے کو ہو رہا ہے۔ اس ڈھانچے کو جس کی جڑیں بے حد گہرائی تک اس مٹی میں پیوست ہیں جہاں بھانت بھانت کے خیالات و افکار مل کر ایک اکائی بناتے ہیں اور اس کے ہر رنگ اپنے آپ میں منفرد اور ساری خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کرنے والی ہیں۔ ایک دوسرے کا احترام کرنے والے ہم ایک دوسرے کے عقائد و نظریات ان کے طرزِ معاشرت کا بھی احترام کرتے آئے ہیں۔ لیکن اب صورت حال دوسری ہے۔ عدم برداشت کا یہ عالم ہے کہ سڑک پر چلتے ہوئے ہونے والے حادثے پر بھی تشدد کا جوالا مکھی پھوٹ پڑتا ہے اور انتہائی اقدام یہ ہے کہ ایک جیتے جاگتے انسان کی جان صرف اس لیے لی جاتی ہے کہ اس نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے یا گاڑی چلانے کے دوران جو احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہیے اس نے نہیں کی، رفتار پر قابو نہیں رکھ سکا وغیرہ وغیرہ اور اس منظرنامے کا سب سے کربہہ سچ یہ ہے کہ یہ سب دن کے اجالے اور لوگوں کے درمیان ہوتا ہے اور وہاں پر موجود لوگ خاموش تماشائی بنے ہوتے ہیں کچھ لوگ تو باضابطہ ان مناظر کے ویڈیو بنا رہے ہوتے ہیں اور پھر اسے سوشل میڈیا کے ذریعہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے سامنے مشتہر کیا جاتا ہے۔ خواتین پر ہونے والے گھریلو تشدد اور نابرابری کے سلوک سے آگے بڑھ کر اب آئے دن نابالغ بچیوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں نے وباء کی صورت اختیار کرلی ہے اور افسوسناک صورت حال یہ بھی ہے کہ یہ سب جس معاشرے میں ہو رہا ہے اسی معاشرے کے چند لوگ اٹھتے ہیں اور اس سارے معاملے کو سیاسی اور مذہبی رنگ دے دیتے ہیں اور پھر شروع ہو جاتا ہے ایک دوسرے پر لعن طعن کا سلسلہ۔ افسوس! صد افسوس!! ہمارے ملک کو ساری دنیا میں مساوات کا علمبردار ملک سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج بھی دنیا کے کئی حصوں میں ہماری تہذیب اور ہمارے معاشرتی تانے بانے کی تقلید ہو رہی ہے۔ یہاں صدیوں سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فرقوں کے لوگ اپنی الگ الگ روایتوں کو سینے سے لگائے نہایت اعتماد سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں موجود احترام کی روشنی ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب اور بہت قریب لانے کا کام کرتی رہی ہے اور ضرورت ہے کہ ہم ایک بار پھر نہایت خلوص کے ساتھ معاشرے میں پھیل رہے اس زہریلے رجحان کو نیست و نابود کرنے کے لیے کمربستہ ہوں۔ ہر شخص کو اپنے اپنے حصے کا چراغ جلانا ہوگا۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ کسی بھی ملک کی حکومت یا لاء اینڈ آرڈر کی بحالی کے لیے قائم ایجنسیاں ایک ایک شہری کی نہ تو حفاظت کرسکتی ہیں اور نہ ہی کسی رویے کا سدباب کرسکتی ہیں یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے سب سے اہم رول عام شہریوں کا ہے خود خواتین کا ہے۔ جنھیں اس صورت حال میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عالمی پیمانے پر ہر دور میں تشدد چاہے وہ جنگ کی شکل میں ہو یا آمرانہ جمہوریت کے دور میں خواتین اس آگ میں ایندھن بنائی جاتی ہیں اور پہلے خاندان اور پھر معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ عورتیں اگر نئی نسل کے لیے اولین مدارس کا کردار ادا کرتی ہیں تو انھیں عزت و وقار عطا کیے بغیر معاشرے میں استحکام اور ترقی کا خواب دیوانے کی بڑ کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

حقانی القاسمی

اصلی لڑائی تو گھر کے اندر کی ہے

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

عورت کو دیوی کا مقدس روپ سمجھنے میں کوئی قباحت تو نہیں مگر اس سے ایک زندہ اور حساس وجود کی نفی ہوتی ہے۔ مشہور فکشن نگار راجندر سنگھ بیدی کی 'لاجونتی' اس کی مثال ہے۔ کہ عورت مٹی کی مورت یا موم کی گڑیا نہیں ہے بلکہ اس کا وجود بھی گوشت پوست سے عبارت ہے۔ اس کی بھی اپنی خواہشیں اور خواب ہیں، آرزوئیں، تمنائیں ہیں۔ مردوں کی طرح ان کے بھی جذبات اور احساسات ہیں۔ ورنہ وہ لاجونتی جو تقسیم ہند کے موقع پر کہیں اور رہ گئی تھی یا اغوا کر لی گئی تھی، جب اپنے شوہر سندرلال کے پاس واپس آتی ہے تو سندرلال کے بدلے ہوئے رویے سے وہ دکھی ہوجاتی ہے کیونکہ سندرلال اسے ایک دیوی کی طرح پوجنے لگتا ہے۔ اسی غم میں وہ دن بہ دن سوکھتی اور کمزور ہوتی جاتی ہے اور اسے اپنا وجود بے معنی سا محسوس ہونے لگتا ہے، کیونکہ زندہ احساسات کے پیکر کو پرستش نہیں، پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت دراصل محبت کے اس لمس سے زندہ رہتی ہے، جس کے اندر بے پناہ healing power چھپی ہوتی ہے۔ لاجونتی اس لمس سے محروم ہوگئی تھی، اسی لیے اس کا ردعمل ذرا مختلف ہوا، عورت اور مرد زندگی کے دو پہیے کی مانند ہیں اور ایک دوسرے کی قربتوں کی دھوپ میں ہی سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور یہ ایک فطری عمل ہے مگر ہمارے معاشرے کا عجب رویہ ہے کہ معاشرہ عورت کو دیوی سمجھ کر اس کے فطری جذبات کو نظر انداز کر دیتا ہے تو کہیں اسے شر اور فتنہ و فساد کی جڑ سمجھا جاتا ہے۔ یہ عجب تضاد ہے کہ ہمارا سماج ایک طرف عورت کو جننی کہتا ہے اور دوسری طرف زنا بالجبر کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ صورت حال اتنی گمبھیر ہوگئی ہے کہ آئین کی سختیوں، سزاؤں اور ہزاروں جلوسوں و مشعلوں کے باوجود بھی عصمت دری کے واقعات میں کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے۔ یہ بہت ہی تشویشناک مسئلہ ہے اور اس کے سدباب کے لیے معاشرے کی ذہنیت کو بدلنا بھی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ضرورت ہے کہ عورتوں میں تعلیمی اور تہذیبی اقدار کی روشنی کو عام کیا جائے ،کیونکہ تعلیم سے ہی عورت صنفی تعصب کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اور سماجی و معاشی تحفظ بھی۔ صادقہ نواب سحر نے بھی اپنے اس انٹرویو میں تعلیم پر زور دیا ہے اور آج کے تناظر میں اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ عصری جامعات میں نسائی مطالعات کے مراکز قائم کیے جائیں تاکہ مختلف میدانوں میں عورتوں کی پسماندگی اور پیش رفت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اس خوبصورت احساس کی حامل ہیں جو خزاں کو بھی بہار میں بدل دیتا ہے اور ریگ زار کو بھی گلزار بنا دیتا ہے۔ وہ بہت مثبت اور تعمیری ذہن رکھتی ہیں، ہر باب میں ان کا نقطہ نظر متوازن ہے۔ وہ گو کہ عملی طور پر ہندی ادبیات سے وابستہ ہیں مگر اردو میں بھی ان کا ایک الگ مقام ہے۔ ایک فکشن نگار، ڈرامہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے وہ اپنی الگ شناخت بنا چکی ہیں۔ ان کا ایک ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا اور یہ ناول اردو، ہندی اور تیلگو زبانوں میں بھی شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'خلش بے نام

سی' اور ڈرامہ کا مجموعہ 'مکھوٹوں کے درمیان' بہت مقبول ہوئے۔ ہندی اور انگریزی میں بھی ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مختلف تنظیموں اور اداروں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزازات سے نوازا ہے۔ پیش ہے ڈاکٹر صادقہ نواب سحر سے حقانی القاسمی کے مکالمہ کا ایک مختصر حصہ:

س: کیا آپ gender discrimination پر یقین رکھتی ہیں؟

ج: gender discrimination نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری سوسائٹی میں ڈسکریمینیشن تو ہر جگہ ہے۔ یہاں تک کہ ماں باپ کی نظر میں بھی اکثر سارے بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آخر انسان جذبات سے بنا ہے۔ یہ اور جینڈر سسٹم تو شاید کبھی ختم ہی نہیں ہوں گے۔ عورت مرد نابرابری ہی نہیں، ہر جگہ جانبداری اور غیر مساوات پھیلی ہوئی ہے اور یہی تو چیلنج ہے۔

س: کیا صرف عورت ہی کو وجود کی لڑائی لڑنی پڑتی ہے؟

ج: جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے، تب سے اپنے جسم کی ساخت اور سماج میں اپنی جگہ بنانے کے لئے عورت کو جدوجہد کرنی ہی پڑی ہے۔ یہ جدوجہد کئی پیمانوں پر ہوتی رہی ہے۔ انسانی ضرورتوں نے بہت بار عورت کو حدود میں باندھا ہوگا لیکن ہر دور میں اس نے یا اس کی ہم جنسوں نے کسی نہ کسی طرح یہ حدود پھلانگنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اس کام میں بہت بار مردوں نے اس کا ساتھ دیا ہوگا۔ وجود کی لڑائی میں سماج مرد اساس بنا اور عورت اکثر بھلا دی گئی۔ پیدائش سے ہی نوزائیدہ لڑکے کو بھی بڑی اہمیت ملی۔ اُسے کمانے والا، گھر بسانے والا اور محنت کرنے والا کہا گیا۔ اس لئے سوسائیٹی میں تعلیم، صحت اور انصاف کے معاملے میں عورت کو دوسرے درجے کے شہری جیسا درجہ ملا۔

س: کیا عورت ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے؟

ج: عورت کو کمزور کہا گیا جبکہ وہ کئی جگہوں پر ذہنی، جسمانی اور معاشی طور پر مردوں سے مضبوط ثابت ہوئی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ عورت کو کم عقل اور کمزور مانا جائے! جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، قدرت سب پر برابر مہربان ہے، وہ سب کے جذبات کو یکساں تحریک دیتی ہے۔ یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ صنفِ نازک کا ذکر آتے ہی عورت جس رنگ روپ اور ڈھنگ کا تصور بن کر ابھرتی ہے، ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی۔ کتنے ہی جسمانی طور پر یا قوتِ ارادی اور خود اعتمادی میں نازک اور کمزور مرد بھی ملتے ہیں، جو ذرا سے دھکے سے دھول میں مل جائیں! سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بھی لڑکی لڑکے سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ عورت نے روایت کی ڈور کو پکڑے رکھا ہے۔ وہ سماج اور خاندان سے جُڑی رہنا چاہتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

'میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں'

س: کیا یہ سچ نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اصلاحی تحریکوں کے بعد ہی فیمنزم کو آواز ملی؟

ج: وقت کے ساتھ ساتھ جو تحریکیں چلائی گئیں، انھوں نے عورت ذات کی حیثیت کو سماج میں مضبوط بنایا اور وقت نے دکھا دیا کہ یہ سماج مرد اساس ہے نہ عورت اساس، یہ تو معاش اساس (ارتھ پردھان) ہے۔ جن گھروں میں عورت کماتی ہے وہاں انھیں پوری اہمیت حاصل ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں راجہ رام موہن رائے، ودیا ساگر، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، مولانا حالی وغیرہ نے عورتوں کے حقوق کے لئے کام کیا۔ اس سے سوسائٹی میں تبدیلیاں آئیں تو لیکن اصلی لڑائی تو گھروں کے باہر سے زیادہ اندر کی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ عورت خود بھی کئی بار روایتوں کی زنجیروں کو توڑنا نہیں چاہتی۔ میری کہانی ''راکھ سے بنی انگلیاں میں 'ترنم زیدی' کا کردار ایسا ہی ہے۔ پڑھی لکھی اور کبھی کبھی صاحبِ قلم خواتین کی شعلہ صفت سوچ بھی سوسائیٹی کے ڈھانچے کو پوری طرح گرا کر تہس نہس کر ڈالنے کی ہمت نہیں رکھتی۔

رمنیکا گپتا کا رسالہ 'یُدھ رَت عام آدمی' میں جب سمرپن نہ کرنے والی خاتون کی کہانی کے طور پر میری کہانی 'شریاں والی' کہانی نمبر میں شایع ہوئی۔ مگر ''منّت'' کہانی کے بارے میں رمنیکا جی نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس میں تو عورت سنگھرش ہی نہیں کرتی۔ حالات کے خلاف بغاوت نہیں کرتی۔ اُس وقت میں نے اس جانب دھیان دیا کہ میری یہ کہانی ایسی ہی ہے جس میں عورت زور سے سوسائٹی کے خلاف آواز نہیں اٹھاتی۔ کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ میرا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کی خصوصی کردار متاشا آواز بلند کیوں نہیں کرتی؟ سماج کے ستونوں کو توڑ کر بکھیر کیوں نہیں دیتی!

عام طور پر عورت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ، گاؤں والی ہو یا شہر والی، بس درجے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ گھر پریوار والی زندگی سے اُس کا میل نہیں۔ شاید میں بھی ایسی ہی تو ہوں! میری

سوچ میں آتش فشاں پہاڑ کے اندر کے لاوے کھولتے سے ہوتے ہیں۔ لیکن بہت جگہوں پر سب کچھ نارمل گزر جائے، اِس کی کوشش رہتی ہے۔عورت سے امید بھی خاموش گزر جانے کی کی جاتی ہے!

رمنیکا گپتا کی اسی بات کے جواب میں، میں نے 'وہیل چیئر پر بیٹھا شخص' اور 'دیوار گیر پینٹنگ' کہانیاں لکھیں اور اس کے کردار اقراء نے بالآخر کر دکھایا، جس کو صحیح معنوں میں احتجاج کہتے ہیں۔عورت کا اپنا choice ہو کہ وہ کیسی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔وہ اپنے حالات سُدھارتی ہے تو اس کی جیت ہے۔

س: کیا عورت وجود کی لڑائی لڑتے لڑتے عصمت اور وقار کی جنگ ہار چکی ہے؟

ج: جھوٹ! یہ ایک اندرونی لڑائی ہے۔جو انسان وجود کی لڑائی نہیں لڑتا ہے، وہ بھی عصمت اور وقار کی لڑائی ہار سکتا ہے۔

س: مرد کی آوارگی اور بے راہ روی میں عورت کو کتنا حصہ دار مانتی ہیں؟

ج: زیرو فی صد۔ ہر انسان اپنی فطرت اور عادت کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔معاشرے کو بے راہ روی اور آوارگی سے روکنے کے لئے اسکول کے زمانے سے value education کی ضرورت ہے۔ گھروں، محلوں، گلیوں میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو اِسے مشن بنا کر فعال رہنا ہوگا۔اس کام میں ماں باپ کا رول تو بہت اہم ہوتا ہے۔

س: آپ کی ترقی اور کریئر پر ازدواجی زندگی کے کتنے منفی اور کتنے مثبت اثرات پڑے ہیں؟

ج: ماشاء اللہ مثبت ہی مثبت۔گھر پریوار میں جڑیں مضبوط رہنے سے شخصیت مضبوط اور تناور ہوتی ہے۔جذباتی اور نفسیاتی سہارے انسان کی زندگی میں اہم ہوتے ہیں۔خاندان سے ملی ہوئی محبت اور احساسِ تحفظ دور تک جانے میں رہنما بھی ہوتے ہیں اور ساتھی بھی۔بچوں کو بھی محبت اور support ملتا ہے۔سب سے بڑی بات یہ کہ انسان کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔اپنی سوچ کو مثبت اور متوازن رکھنے کے لئے فیملی کے ساتھ اچھی bonding کتنی ضروری ہے! میرے لئے بھی رشتوں نے ٹانک کا کام دیا ہے۔

س: من کی کوئی بات جو دنیا سے شیئر کرنا چاہتی ہوں؟

ج: تعلیم اور محنت کی عادت ہی معاشرے میں ہمیں مقام دلا سکتے ہیں:

کیا گِلہ کرتی میں زمانے سے
در حقیقت کمی رہی مجھ میں

□□□

فرہنگ آصفیہ سے

آزاد۔ ف۔ اسم مذکر۔ (۱) پابند کا نقیض۔ وہ شخص جو کسی کا غلام نہ ہو۔ وہ آدمی جو کسی بات کا پابند نہ ہو۔ (۲) تنہا آدمی۔ مجرد آدمی۔ اکیلا آدمی۔ (۳) وہ شخص جس کی طبیعت میں کسی طرح کی روک نہ ہو۔ (۴) ایک قسم کے فقیر بھی ہوتے ہیں۔ جو سر داڑھی۔ مونچھیں بھویں پلکیں سب کو صفا چٹ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو مذہبی قواعد سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ فرقہ کوئی ڈیڑھ سو برس سے نکلا ہے۔ یہ لوگ بڑے حاضر جواب اور گستاخ ہوتے ہیں۔

میاں بھیج دو کچھ جو توفیق حق ہو
کھڑا ایک آزاد ہے تیرے در پر (انشا)

چھوڑ بیٹھا جو تعلق عالمِ ایجاد کا
سرو چیلا ہو گیا ہے کیا کسی آزاد کا (صبا)

بے تعلق پن بھی آخر قید ہے
قید پائی خاطرِ آزاد میں (شیفتہ)

(۵) بے شرم و بے حیا آدمی۔ بے ادب و بے لحاظ آدمی۔ گستاخ آدمی (۶) نڈر آدمی۔ نربھے آدمی۔ بے دھڑک آدمی۔ (۷) صاف گو آدمی۔ کھرا اور بے لاگ آدمی۔ کھر تل آدمی۔ بے لگاؤ شخص۔ (۸) سرو کے درخت کو بھی آزاد کہتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ خزاں کے عذاب سے بری اور بارہ مہینے ہرا رہتا ہے۔ بعض لوگ راستی کے باعث آزاد کہتے ہیں۔ اور جو لوگ اسے بے ثمر خیال کرتے ہیں غلطی پر ہیں۔

شاعرات کے منتخب اشعار

ہمارے درد نے معنوں سے لذتیں لے کر
ہر ایک لفظ کے پہلو میں شاعری کی ہے

کتاب پھول قلم سب خوشی خوشی رکھنا
کلی، گلاب، حنا درمیاں ہنسی رکھنا

صغریٰ عالم

اشک اپنی آنکھوں سے خود بھی ہم چھپائیں گے
تیرے چاہنے والے شور کیا مچائیں گے

ہم تیری محبت کے جگنوؤں کی آمد پر
تتلیوں کے رنگوں سے راستے سجائیں گے

نوشی گیلانی

روکھی سوکھی پھانک رہی ہوں
تن کی گنگا ہانک رہی ہوں

چھ گز لمبی ساری سے میں
سارے گھاؤ ڈھانک رہی ہوں

سکینہ ساجد پنہاں

وہ چھانٹتے رہے شاخ اور سایہ دار ہوئی
یہی تو بات بہت ان کو ناگوار ہوئی

ڈبویا اتنا کہ پیراک کر دیا مجھ کو
یہ دشمنی تو مجھے خوب ساز گار ہوئی

نسیم سید

اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر
مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے

جھوٹ لکھوں تو ساری بیاضیں تجھ سے ہی منسوب کروں
سچ بولوں تو لکھنے میں اوروں کا ذکر بھی آتا ہے

حمیرا رحمٰن

وادیٔ درد میں جانا ہے اگر تجھ کو صبا
برگ آوارہ ہوں آ مجھ کو اڑا کر لے جا

تری نگاہ میں یہ جو کرن سی کانپتی ہے
دیارِ دل میں یہ کیسا چراغ جلتا ہے

حسنیٰ سرور

وہ نظر عکس تھا جس میں کئی دنیاؤں کا
ٹوٹے آئینے کا انبار نظر آتی ہے

رختِ دل، صحبتِ غم، معبد جاں خاک بسر
زندگی برسرِ پیکار نظر آتی ہے

ساجدہ زیدی

ترے خیال کی ٹھنڈک ترے فراق کی آنچ
خوشی کی طرح ترا غم رہا ہے آنکھوں میں

زمانے بھر کی نگاہوں کی کیوں رہوں مرکز
فسانے اور بھی ہیں میری داستاں کے سوا

زبیدہ تحسین

سید اسرار الحق سبیلی

ڈاکٹر حلیمہ فردوس

بچوں کی ایک اہم ادیبہ

بچوں کے ادب میں خواتین قلم کاروں کی صد سالہ تاریخ ہے، خواجہ حسن نظامی دہلوی کی اہلیہ محترمہ خواجہ لیلیٰ بانو نے 1919 سب سے پہلے ''بچوں کی کہانیاں'' لکھ کر بچوں کے ادب میں خاتونِ اول کا مقام حاصل کیا ہے، اس کے بعد حجاب امتیاز علی تاج، صالحہ عابد حسین، بیگم قدسیہ زیدی، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عفت موہانی، شفیقہ فرحت، اشرف صبوحی، ثریا فرخ، مسعودہ حیات، اے۔ آر۔ خاتون، عطیہ پروین، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، رفیعہ منظور الامین، عابدہ محبوب اور سیدہ اعجاز وغیرہ نے بچوں کے ادب کے گیسو کو تابدار بنانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔

حالیہ عرصہ میں بچوں کی قلم کار خواتین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، ان میں کشور ناہید، عقیلہ بانو، نور جہاں نور، ڈاکٹر بانو سرتاج، مہر رحمٰن، زینب نقوی، شہناز نبی، طیبہ بیگم، ڈاکٹر عالیہ خان، شاکرہ بیگم، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، شاہوار بیگم، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی خدمات نہایت وقیع اور ناقابلِ فراموش ہیں، آج ہم بچوں کی ایک اہم ادیبہ ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی بچوں کے ادب کے تئیں خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

بنگلور سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر حلیمہ فردوس ریاست کرناٹک میں اپنی ایک ادبی شناخت رکھتی ہیں، بڑوں کے لئے انہوں نے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور انشائیے لکھ کر اپنی پہچان بنائی ہے، ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ: ''ارج'' اور انشائیوں کے مجموعے: ''ماشاء اللہ'' اور ''بہر کیف'' شائع ہو کر اہلِ علم وادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس پوری عمر رفتہ درس وتدریس سے وابستہ رہی ہیں، اور نصابی کتب کی تشکیل وتدوین میں حصہ لیتی رہی ہیں، اس موقع پر انہوں نے محسوس کیا کہ اردو میں لسانی کھیلوں سے متعلق کتابیں ناپید ہیں، انہوں نے اپنے اختراعی ذہن سے لسانی کھیلوں پر مشتمل کتاب: ''الفاظ کی دنیا'' ترتیب دی ہے، جس سے اردو زبان وادب کی تدریس کا ایک نیا باب کھلا ہے، جو انوکھا بھی ہے اور اچھوتا بھی، اس میں ذہنی ورزش بھی ہے اور ذہنی تفریح بھی، پروفیسر لئیق صلاح کے بقول: ''اس طرح کی ذہنی مشقیں، مستقبل کی قلم فرسائیوں کے لئے بنیاد کا کام کرتی ہیں، پروفیسر خالد سعید کا خیال ہے کہ: ''الفاظ کی دنیا'' میں دقیق نظری کے ساتھ لسانی رموز کو کھیلوں میں پیش کیا گیا ہے، جس کے سبب زبان کی تدریس نہایت آسان ہوگئی ہے۔''

تعلیم وتدریس سے متعلق ڈاکٹر فردوس کی دوسری کتاب: ''تعلیم وتدریس کے نئے تناظر'' ہے، جس میں تعلیم وتعلّم سے متعلق فنی گفتگو کی گئی ہے، اور اس میں اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کی سطح پر اردو کی تدریس، نصاب کی تکمیل، طلبہ کی شخصیت کی تعمیر میں اساتذہ کا کردار، معلّم کی خصوصیات، لڑکیوں کو خود کفیل بنانے والے ادارے اور اساتذہ کی ذمہ داریاں اور ادب اطفال کے تئیں منفی رویّہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصنفہ کو تدریسی رموز پر اچھی مہارت حاصل ہے، اور وہ ایک کامیاب، ایمان دار، مخلص، ہمدرد اور بابصیرت معلّمہ ہیں، جنہوں نے اپنے پیشے اور فن سے محبت، لگاؤ اور انصاف کا ثبوت دیا ہے۔

بچوں سے محبت کا دوسرا پہلو بچوں کے لئے ان کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا مجموعہ: ''بچوں کی دھنک رنگ دنیا''ہے، جو

2016 میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا ہے۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس صاحبہ نے لسانی کھیلوں کی طرح ایک نئے تکنیکی انداز میں بچّوں کے لئے کہانیاں ترتیب دی ہیں، جن میں بچّوں کی دل چسپی، تفریحِ طبع، شوخی، شرارت، ظرافت اور طنز ومزاح کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے، بظاہران کی کہانیاں تفریحی نظر آتی ہیں، لیکن ان کے جلو سے تربیتِ اخلاق، انسانی ہم دردی، جانوروں سے محبّت، خدمتِ خلق، ایمان داری، محنت، صبر، اتحاد، حبّ الوطنی، قومی یک جہتی جیسی اعلیٰ اقدار پر مشتمل بیانات کے علاوہ جدید ٹکنالوجی اور عصری معلومات کے ساتھ، ماحولیات کا تحفظ اور شجر کاری جیسے موضوعات مترشح ہوتے ہیں، اور بچّوں کو دعوتِ غور وفکر وعمل دیتے ہیں۔

''بچّوں کی دھنک رنگ دنیا'' میں چار مضامین، دو ڈرامے اور چودہ کہانیاں ہیں، ''طاقتِ پرواز''، ''پیسے اگلتی مشین''، ''کوہ پیائی کا جنون'' اور ''کلام کو سلام'' کا تعلق مضامین سے ہے، طاقتِ پرواز مس مالتی ہولاّ پر لکھی سوانحی کتاب ہے، جس کے مصنّف اننت کرشنا ہیں، مس مالتی ایک معذور لڑکی تھی، جو پولیو کا شکار ہوگئی، اس کے جسم کا نچلا حصّہ بالکل بے کار ہوگیا تھا، اس کے ۳۲ آپریشن ہوئے، لیکن اس نے تعلیم جاری رکھی، آپریشن سنٹر میں اسے خود اعتمادی کا درس دیا جاتا، اور اپنا کام خود کرنے کی ترغیب دی جاتی، علاج کے طور پر اسے روزانہ وہیل چیر ڈھکیلتے ہوئے آدھا کیلومیٹر طے کرنا پڑتا تھا، اور کاندھوں کو مضبوط کرنے کے لئے شاٹ پٹ کی مشق کرائی جاتی تھی، اسی مشق نے اس کے ارادے مضبوط کئے اور وہ ہر سال ماہ دسمبر میں عالمی یومِ معذورین کے موقع پر شاٹ پٹ کے مقابلہ میں حصّہ لینے لگیں، انہیں انعامات ملنے لگے، جس کے نتیجہ میں انہیں بینک کی ملازمت مل گئی، سال 1996 انہیں ارجن ایوارڈ اور ۲۰۰۱ء میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا، ''کوہ پیائی کا جنون'' خاتون کوہ پیماؤں سے متعلق مضمون ہے، جیسے: بچندری لال، ریتا گامبو، ریکھا شرما، کلپنا داس، جنہوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر دنیا کی بلند ترین ایورسٹ کی چوٹی سر کر کے وہاں اپنے ملک کا پرچم لہرائے ہیں۔

''کلام کو سلام'' بابائے میزائیل اور سابق عوامی صدر جمہوریہ ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام کی محنت، جدّ وجہد، ریاضت، ایمان داری، رحم دلی اور سادگی پر مشتمل دل چسپ خاکہ ہے۔

''سارے جہاں سے اچھا'' اور ''انمول تحفہ'' ڈرامے ہیں، دونوں ڈرامے بچّے آسانی سے اسٹیج کر سکتے ہیں، پہلے ڈرامہ میں ایکتا کا درس ہے، اس میں ایک فرض شناس اور ہم درد استاد رام ناتھ کا کردار اہم ہے، جس کے رگ رگ میں دیش پریم بسا ہوا ہے، جو اپنے شاگردوں کو بھی دیش سے پریم کا درس دیتے ہیں، انہوں نے اپنے مرنے کے بعد اپنے اعضاء کا عطیہ کر دیا ہے، ان کے مرنے کے بعد ان کا قلب سرجری کر کے فرقہ پرست سیاست داں دین دیال کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے، تو وہ بھی رام ناتھ کی زبان بولنے لگتا ہے، اور اپنے حمایتی کو نفرت کے بجائے محبّت کا پاٹھ پڑھانے لگتا ہے، پریس کے نمائندوں کو حیرت ہوتی ہے کہ دین دیال میں اچانک یہ تبدیلی کیسے ہوگئی ہے، ان کی آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں، کل کے دشمن آج کے دوست کیسے بن گئے؟ اور دیش کے سولہ کروڑ مسلم بھائیوں کو وطن سے باہر کرنے کی سوچ کو غلط بتا رہے ہیں؟ مجمع سے ایک جوان جواب دیتا ہے: یہ سب ہمارے ماسٹر رام ناتھ جی کے دل کا کرشمہ ہے، ماسٹر جی کے دل کی پیوند کاری سے دین دیال جی بڑے دیالو بن گئے ہیں، ان کے سینے میں بھارت واسیوں کی محبّت کا دریا بہہ رہا ہے، آج یہ منظر دیکھ کر ہمارے ماسٹر جی کی روح بہت خوش ہو رہی ہوگی، کاش ہمارے سارے ہی نیتا بھید بھاؤ کو بھول کر اسی طرح گلے لگ جائیں تو ہماری دھرتی سورگ بن جائے گی۔

دوسرا ڈرامہ: ''انمول تحفہ'' میں گرما کی تعطیلات میں بچوں کی شرارت، کھیل، تفریح اور ہنگامے کے بعد اسکول کھلنے کا دن آجاتا ہے، بچے اپنا اپنا بیگ سنبھالے خوشی خوشی اسکول جاتے ہیں، آج انہیں پرانے دوستوں سے مل کر خوب باتیں کرنے کا موقع ملا ہے، بچے اسکول کے گراؤنڈ میں رکھے پودوں کو دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، اتنے میں اسمبلی شروع ہو جاتی ہے، پرنسپل صاحب تقریر فرماتے ہیں: پیارے بچو! آج یومِ ماحولیات ہے، ماحول کا تحفظ ہماری ذمہ داری ہے، جس طرح تمہارے ہنستے چہروں کو دیکھ کر ہمارا دل کھل اٹھتا ہے، اسی طرح ایک چھوٹے پودے کو پیڑ بنتے دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے، جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ ہمارے شہر کی سڑکوں پر جدھر نگاہ دوڑاؤ بس گاڑیاں ہی گاڑیاں ہیں، ان کی آوازوں اور ان سے اٹھنے والے دھوئیں کو روکنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم پودے لگا کر اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں، درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آکسیجن میں بدلنے والی فیکٹری ہیں، تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بعض درختوں میں شور کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، بچے پرنسپل صاحب کی دل نشیں تقریر سے متاثر ہو کر اسکول کے میدان میں پودے لگاتے ہیں، انہیں پانی دیتے

ہیں، پرنسپل بچوں کو گھر میں لگانے کے لئے ایک ایک پودا تحفے میں دیتے ہیں، بچے گھر پہنچ کر اپنے والدین سے کہتے ہیں: آج ہمیں اسکول سے ایک انمول تحفہ ملا ہے، ہم اس انمول تحفے کی حفاظت کریں گے، ہم اپنا ماحول بچائیں گے، آیئے اب ہم اپنے گھر کے سامنے اس پودے کو لگائیں گے۔

اس طرح مصنفہ نے ڈرامہ اور تفریح کے پیرایہ میں بچوں کو ماحولیاتی مطالعہ Environmental Education کا دل چسپ سبق پڑھایا ہے، اس کی اہمیت کو ان کے دلوں میں اجاگر کرایا ہے، اور عملی مشق کراکے انہیں ایک ذمہ دار شہری کی طرح جینا سکھایا ہے۔

چودہ کہانیوں میں: گھونگے میاں کی شرارت اور ہتن میاں کے کارنامے خالص مزاحیہ اور تفریحی کہانیاں ہیں، لوٹ کے بدھو گھر کو آیا مزاح آمیز کہانی ہے، ہیلو بی بندریا! مزاح، تفریح، اور معلومات کا مجموعہ ہے، ''روبی کا پومی'' روبوٹ سے متعلق دل چسپ و مفید معلومات کہانی کے انداز میں پیش کی گئی ہے، ••••• کی گزارش میں ربر کی اہمیت کو دل چسپ کہانی کی شکل دی گئی ہے، اسی طرح کہانی: ''میری سہیلی'' یعنی کتاب پر مضمون کو کمالِ فن کے ساتھ کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، ''فرماں بردار چھتری'' بھی ایک تمثیلی کہانی ہے۔

''تتلی اڑی'' تفتاسی کہانی ہے، جس میں سماجی برائیاں اور فضائی آلودگی کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے، ''رانی اور رام سنگھ'' جانوروں سے محبت کی ایک اہم کہانی ہے، ''مس روزی'' بچوں کی ہم درد اور شفیق ایک ٹیچر کی کہانی ہے، جنھوں نے اپنے پیار بھرے انداز اور بچوں کی نفسیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بچوں کی اصلاح و تربیت اور بچوں میں اتحاد و محبت اور مل جل کر کام کرنے کی عمدہ مثال قائم کی ہے۔

''محبت کا صلہ'' رحیم چاچا کی محبت، ہم دردی، صبر، محنت اور وفاداری کے صلہ میں ملی درد بھری کہانی ہے، بیوی کی جدائی، بیٹے کی خود غرضی و بے مروّتی، مالکن بیگم ناہید کی ناقدری اور بدگمانی نے کہانی کو نہایت المیہ بنا دیا ہے۔

''دعاؤں کا تمغہ'' ایک اہم کہانی ہے، اس کہانی میں دانش اور نازش کی امی کا کردار بہت اہم ہے، نازش کو ہمیشہ کھیل کے مقابلوں میں تمغے حاصل ہوئے، وہ اپنے والدین اور دوستوں کے سامنے اپنے جیتے ہوئے میڈلس کی نہ صرف نمائش کرتا، بلکہ بڑے بھائی دانش کی کھلّی بھی اڑاتا تھا، اس کے والد نازش کی پیٹھ ٹھوک کر کہتے: میرا بیٹا تو مجھ پر گیا ہے، دیکھنا یہ بڑا ہو کر کھیل کی دنیا میں بڑا نام کمائے گا، بڑے بڑے انعامات و اعزازات حاصل کرے گا، بابا کے تعریفی کلمات سن کر نازش کا سینہ فخر سے پھول جاتا اور بے چارا دانش اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا، مگر اس کی ممی ہمیشہ اسے تسلّی دیتیں اور ہمت بندھاتے ہوئے کہتیں: بیٹا، اللہ نے ہر ایک کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے، تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو، جس طرح تم اپنی کلاس میں اوّل آتے ہو، رینک حاصل کرتے ہو، یہ سب نازش کی قسمت میں کہاں، تم دیکھنا ایک دن آئے گا جب ہر طرف تمہارے نام کے چرچے ہوں گے، تمہارے سینے پر کئی تمغے سجے ہوں گے۔

چنانچہ وہ دن بھی آیا کہ ایک طرف نازش میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا، اور کسی طرح فوج میں بھرتی ہو گیا، دوسری طرف دانش نے اسکول کی پڑھائی ختم کر کے کالج میں قدم رکھا، امتیازی نمبرات سے کامیاب ہونے کا اس کا ریکارڈ برقرار رہا اور وہ ڈگری حاصل کر کے ایماندار پولیس آفیسر بن گیا، اس نے اپنی ایمانداری اور دیانت داری سے علاقوں کے مظلوم افراد کی دادرسی کی، علاقے کے سارے لوگ دانش کے قصیدے پڑھنے لگے، ہر طرف دانش کی ایمان داری اور فرض شناسی کے چرچے ہونے لگے، چھبیس جنوری کے دن اسے حکومت کی جانب سے اس کی ایمانداری اور فرض شناسی پر انعام سے نوازا گیا، جیسے ہی وہ اعزاز حاصل کر کے اسٹیج سے نیچے اترا، تھوڑے ہی فاصلہ پر اس کا چھوٹا بھائی نازش اور ممی کو دیکھ کر حیران ہو گیا، نازش اس سے لپٹ کر کہنے لگا: بھائی جان! آج آپ جیت گئے اور میں ہار گیا، بچپن مین جو تمغے میں نے حاصل کئے تھے آج وہ بے وقعت ہیں، ان تمغوں نے مجھے بگاڑ دیا، جب کہ آپ کا یہ تمغہ آپ کی کامیاب زندگی کا اعلان ہے، آپ کو یہ اعزاز بہت بہت مبارک ہو۔

غرض ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے ایک نئے اور منفرد انداز میں بچوں کو کہانیوں سے متعارف کرایا ہے، انہوں نے اصلاحی، تربیتی اور معلوماتی مواد کو کہانی کے فن اور سانچے میں ڈھال کر بچوں کے لئے دل چسپ اور پرکشش بنا دیا ہے، اور بچوں کے ادب کی تاریخ میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے، ڈاکٹر حلیمہ فردوس بچوں کی کہانیوں، ڈرامے اور مضامین میں اپنے منفرد، اختراعی و تکنیکی انداز و اسلوب کی بدولت بچوں کے ادب میں مدّتوں یاد رکھی جائیں گی۔□□□

Dr. Syed Asrarul Haque

Asst. Prof. & Head of Department.Dept. of Urdu

Govt. Degree and PG College

Siddipet District-502103 (Telangana)

تحریک نسواں اور چند اردو ناول

ناز آفرین

تعارف: تحریکِ نسواں صنفی امتیازات واستحصال کے خلاف ایک شعوری احتجاجی تحریک ہے ۔ اسی مناسبت سے Feminism کا لفظ 1871 میں انگلینڈ میں خواتین کے مساویانہ حقوق کی لڑائی میں پہلی بار استعمال ہوا۔ ابتدأ لفظ تانیثیت حقوق نسواں کا ترجمان نہیں تھا۔ بعدازاں اصطلاح بنا کر Feminism سے جوڑ دیا گیا ۔ میری ڈول اسٹون کرافٹ نے Vindication of the right of women (1790) میں سوال اٹھایا کہ ''کیا انسانی حقوق وآزادی صرف مردوں کے لیے ہیں؟'' تحریک نسواں کا ہدف دونوں جنسوں کے امتیازات مٹا کر تمام اختلاف کا بدل یا اہداف ہے ۔ سمون دی بوائر اپنی تصنیف "The Second Sex'' میں (1949) مردوں کے خیال ونفسیات کو واضح کرتی ہیں۔ ''عورت پیدائشی طور پر ہمارے طے کردہ صفات کی حامل نہیں ہوتی بلکہ پدری معاشرہ میں عورت بنادی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ خود کو اُن ہی صفات سے متصف سمجھنے لگتی ہے جو مردوں کی طرف سے اُن کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہیں۔''

خواتین معاشرتی سطح پر اپنے حقوق سے عدم واقف رہتی ہیں۔ نکاح ،مہر،طلاق،خلع ،وراثت،ولادت ،تقسیم جائیدادوغیرہ ان میں خصوصی طور پر شامل ہیں۔ ان تمام مسائل کی براہ راست آگہی کے لیے یورپ میں گذشتہ دوصدی سے زائد عرصے سے سماجی ،ادبی،معاشی اور سیاسی تحریکیں وجود میں آتی رہی ہیں ۔ جس کا مقصد معاشرتی سطح پر خواتین کا مقام متعین کرنا ہے۔ مرد کی بیجا اجارہ داری کا خاتمہ کرنا ہے۔ خواتین پر ہورہے مظالم واستحصال کے ردعمل پر ہی تانیثیت کا ظہور ہوا۔ یہ تحریک بالخصوص استقامت کے ساتھ اپنا اثبات چاہتی ہے۔ اس فکر کو فروغ دینے میں ڑولیا کرستیوا، سمن دی بوائر، ایلی سیزو، ژاویے گوئٹے ،ورجینیاؤ ولف، ایلاسسکن آسٹرانگیر، ماریا انٹونی اور ایون جو دِتھ وغیرہ نے آواز اٹھائی۔ تانیثیت کے تصور کی شروعات مرد کا جبر، جنس کی بنیاد پر عورتوں کی ثانوی حیثیت ، صنفی تفرقہ ،استحصالی رشتے ،ظلم و وراثت اور شخصی محرکات سے ہوئی۔ تانیثیت نے روایتی سماج سے مرد اور عورت کے سماجی ،تہذیبی و مذہبی حیثیت کے متعلق بہت سے سوالات کیے۔ Bellington Greig کے مطابق ''یہ ایک خواتین کی تحریک ہے۔ جو انسانی رشتوں کی دوبارہ ترتیب کو تلاش کرتی ہے۔''

خواتین کا پہلا حقوق نسواں کنونشن سینیکا فالز (امریکہ) میں 1884 منعقد کیا گیا۔ اس کنونشن نے متوسط طبقے کی خواتین کو ایک عوامی فورم مہیا کیا۔ اسی کنونشن میں حقوق نسواں کا بنیادی تصور جاری کیا گیا۔ اِس اعلامیہ میں خواتین کے خلاف ناانصافی کے خاتمے اور متحدہ ریاست ہائے امریکہ کی شہری ہونے کی حیثیت سے مکمل حقوق کے حصول کا مطالبہ تھا۔ خواتین نے مرد اساس نظام واقدار کو چیلنج بھی کیا۔ طبقہ نسواں کی آزادی کی وکالت کی ۔ اسٹوارٹ خواتین کی آزادی اور حق رائے دہندگی تو چاہتا تھا لیکن شوہر اور بیوی کے رشتے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ ایسے میں تانیثی فکر صنف اور جنس کی لڑائی بن کر رہ گئی تھی۔ ڈول اسٹون کرافٹ خواتین کو با اعتماد ،با کردار اور متحرک بنانا چاہتی تھیں۔ وہ عورتوں کو جسمانی طور پر نازک مانتے ہوئے عقلی طور پر مرد سے بالاتر سمجھتی ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ صنفی بنیاد پر سماج انھیں کمزور مانتا ہے۔ اس لیے خواتین تعلیم حاصل کر کے عقل مند، ذہین، سمجھدار اور ذمہ دار شہری بنیں ۔ اپنے اندر کی غلامانہ ذہنیت کو ختم کریں۔ اپنی شخصیت،

صلاحیتوں اور قابلیتوں کو سماج کے سامنے پیش کریں۔
ان حالات میں از سرِ نو آزادئ نسواں کے لیے باقاعدہ بین الاقوامی سطح پر شعوری بیداری تانیثیت کی معتبر مفکروں نے International Women's Conferences کیے۔ تانیثیت کے اثرات عالمی علوم و فنون پر مرتب ہو رہے تھے۔ اسے منظم کرنے کے لیے اقوامِ متحدہ نے بڑے پیمانے پر چار کانفرنس منعقد کیے۔ یہ کانفرنس پانچ سے دس برس کے وقفے سے ہوتے ہیں۔ خواتین کے ساتھ تمام تر شعبہ جات میں مساوات کو قائم کرنا اور فروغ دینا تھا۔'' کانفرنس نے خواتین کو اپنے حقوق کے تئیں بیدار کیا۔ ان کے شعور و ادراک میں حقوق کی حصولیابی کے لیے راہیں ہموار کیں۔

پہلی بین الاقوامی کانفرنس: یہ Maxico (1975) میں ہوا۔ جس میں 313 سرکاری کارندے شامل ہوئیں۔ مختلف NGO کے 6000 نمائندے شریک ہوئے۔ خواتین کے ساتھ روا سلوک کے خاتمے کے لیے غور و فکر کیا گیا۔ کئی اہم نکات پر کام کرنے کا عملہ وجود میں آیا تاکہ خواتین کو مساوی حقوق مل سکیں۔

دوسری عالمی کانفرنس: یہ کانفرنس Copenhegen(1980) میں ہوا۔ اس کا عنوان "World Conference of the United Nation Decade for Women" تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد Maxico میں ہوئے منصوبہ بندی کے نفاذ کی نگرانی تھی۔ جس کا موضوع خواتین کے لیے معاش، صحت اور تعلیم تھا۔ دوسرا پروگرام بھی منعقد ہوا۔ اس کا مقصد "Women right to inheritance women ownership child custody کو مضبوط کرنا تھا۔

تیسری عالمی کانفرنس: Nairobi(1985) میں منعقد ہوا۔ "World conference to review and appraise the achievement of the United Nation decade for women" کے زیرِ عنوان ہوا۔ کانفرنس کا بنیادی مقصد گذشتہ دس سالہ نکات پر غور و فکر تھا۔ جس میں حقوقِ نسواں کے حصول میں آنے والی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1900 وفد اور 157 ریاستوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ حکومت نے "Nairobi forward looking strategy" کو منتخب کیا۔ جس میں قومی سطح پر جنسی مساوات پر خواتین کی کارکردگی کو فروغ دینا طے پایا۔

چوتھی عالمی کانفرنس: اس کا انعقاد Beijing (1995) میں ہوا۔ اس نے خواتین کے حقوق میں ہونے والے کانفرنسوں میں تبدیلی کی۔ یہ صنفی مساوات پر ایک عالمی مدعا بنا۔ اس طریقہ کار میں "Beijing declaration and the platform for action" تھا۔ جسے 189 ملکوں نے قبول کیا۔ خواتین کو معاشی اور صنفی اعتبار سے مضبوط کرنے کے لیے کوشاں رہی۔ اس میں 7000 شرکا تھے۔ جس میں 600 نمائندے حکومت کے تھے۔ 4000 سے زائد NGO کے نمائندے شامل ہوئے۔ 4000 میڈیا کار شامل ہوئے۔ مذکورہ کانفرنس کے علاوہ ملکی پیمانے پر حقوقِ نسواں کے عملی اقدام 2000، 2005 اور 2015 میں ہوئے۔ ایک وفد کا قیام عمل میں آیا۔ Beijing+20 کے نام سے اس نے تمام نشستوں کی کارکردگی کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس کے لیے بہ قدرِ ضرورت اصول مرتب کیے۔''

ہندوستانی ناولوں میں تانیثی فکر کی جہات قدیم زمانے سے ہیں۔ صنعتی عہد نے نیا رخ عطا کیا۔ اس کی پہلی بازگشت فرانس، برطانیہ، شمالی امریکہ، ریاست ہائے متحدہ اور کنیڈا وغیرہ میں ملتی ہے۔ اردو ادب کے تانیثی فکر کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نعرے بازی کرنے کے بجائے منظم طریقے سے احتجاج کرتا ہے۔ اس کا مقصد خواتین کو حق و انصاف دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ رشید جہاں اور عصمت چغتائی نے تانیثی فکری جہات پہلے پیش کیے۔ فطری طور پر مرد قوی اور عورت نازک ہوتی ہے۔ ہر اعتبار سے جنس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ سماج انھی تہذیب و تمدن اصولوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ ان کا الگ الگ مقام متعین کرتا ہے۔ ان کے افعال و کردار مخصوص کیے جاتے ہیں۔ صنف کی شناخت ہمارے سماج میں اس طرح کی جاتی ہے کہ مرد آزاد، با اختیار، حاکم اور قوی ہے۔ وہیں عورت نرم و نازک، کمزور، صابر، فرمانبردار اور ماتحت ہوتی ہے۔ ان کی تقسیم جنس کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ مرد اپنے گھر کا سردار اور عورت گھر کی نگراں ہے، بعض گھروں میں محکوم مانی جاتی ہے۔ تمام گھریلو امور، بچوں کی پرورش و نگہداشت، تعلیم و تربیت، بڑوں کی خدمات، شوہر کی اطاعت شعاری، مہمان نوازی سب عورت کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ مرد صرف باہر کے امور انجام دیتا ہے۔ گھریلو امور میں اس کی شرکت نہیں ہوتی۔ ان امتیازات کی وجہ سے عورت کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے عورت میں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے۔

اکثر خاندانوں میں لڑکی کی پیدائش کو ایک المیہ سمجھا جاتا ہے۔ گھر میں پہلے لڑکی پیدا ہوئی تو اس کی ذمہ دار عورت قرار دی جاتی ہے۔ لڑکی پر اخراجات گنوائے جاتے ہیں۔ ان کے تعلیم و تربیت کو موضوع

بحث بنا کر عورت کو پریشان کیا جاتا ہے۔اس کے بہ نسبت لڑکے کی تعلیم و تربیت پر روپے خرچ ہونے سے واپس بھی آئیں گے۔ شادی میں جہیز ملے گی ۔ بیٹا بوڑھے ماں باپ کا سہارا ہوتا ہے۔ گویا کہ دونوں کی پیدائش سے ہی ایک خاص قسم کا برتاؤ جنسی بنیاد پر روا رکھا جاتا ہے۔اس طرح صنف کے نام پر امتیاز برتا جاتا ہے۔

مرد وعورت کے درمیان حیاتیاتی فرق جنس کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر صنف کی تشکیل ہوتی ہے۔صنف کا تصور 1970 کے دہے میں منظر عام پر آیا۔ یہ حیاتیاتی جنسی تفرقہ کو ظاہر کرتا ہے۔ جو مرد و زن کے تصور کو نمایاں کرتا ہے۔ بعض Feminist کا خیال ہے کہ یہ فرق دراصل پدرسری نظام کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ عورت کی ماتحتی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ پدرسری نظام کی ایک اہم صورت عورت پر تشدد ہے۔ دنیا کے مختلف سماجوں میں عورتوں پر مظالم کی مختلف صورتیں رہیں ہیں ۔ اس تشدد کے خلاف "International Women's Movement" میں بحث کے دوران یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تشدد کا یہ طریقہ صدیوں سے سماج میں مروج ہیں ۔ جن میں ستی پرتھا، دیوداسی نظام ، لڑکیوں کے پاؤں باندھنے کی رسم ،عورتوں کو جادو کے لیے ذبح کرنا، لڑکیوں کے اعضائے مخصوصہ کو کاٹ ڈالنا، گائناکولوجی کے لیے عورتوں کو ہلاک کرنا، زنا بالجبر، بچیوں کے ساتھ گھریلو تشدد اور جسمانی اذیت وغیرہ خاص ہیں ۔ اس کے علاوہ بھی مختلف صورتیں ہیں جو خواتین و بچیوں پر آزمائے جارہے ہیں ۔اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مغرب میں خاندان کا شیرازہ پوری طرح بکھر چکا ہے۔..... مرد وعورت کے پُرشور اور ہیجان انگیز وصال کا معاملہ پرانا ہو چکا۔ سماج میں Gayism اور Lisbianism جڑ پکڑ رہے ہیں ۔اور انھیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے قوانین وضع ہو رہے ہیں۔ مردوں کی مردوں سے شادیاں ہو رہی ہیں ۔ عورتیں عورتوں سے شادی کر رہی ہیں ۔ بات Nuclear Family سے Single Parent اور Testube Baby سے Sperm Bank سے Cloning تک جا پہنچی ہے ۔ رحم کرائے پر مل رہے ہیں اور بچے جنسی عمل کے بغیر بھی وجود میں آرہے ہیں۔اسی گمبھیر اور الجھی ہوئی حالت میں ''خاندان'' کا ادارہ بھلا کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟''

راشد الخیری عورت کو خاندان میں سرغنا کی حیثیت دیتے ہیں، اگر وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی تو خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔اسی لیے وہ عورت کے 'اسلامی حقوق' کی بحالی کے لیے ہر وقت سرگرم تھے، ان کا کہنا تھا کہ ''مسلمان اگر اب تک نہیں سمجھے تو اب سمجھ لیں کہ آج عورت 1857 کی عورت نہیں، وہ 1934 کی عورت ہے ......اس وقت مسلمانوں نے ٹھنڈے دل سے اس کے حقوق واپس نہ کیے جو اسلام اس کو دے چکا ہے تو ارتداد کیسا؟ وہ اسلام سے ہی کنارہ کش ہو جائے گی۔'' 'تپاح حوتپ' جسے دنیا کا سب سے پہلا معلوم ''معلم اخلاق'' کہا جاتا ہے۔ ساڑھے چار ہزار سال پہلے لکھتا ہے کہ ''اگر تو دولت مند ہے تو اپنے لیے بیٹا حاصل کر......اگر تو صاحب حیثیت ہے تو اپنا گھر بنا اور گھر میں اپنی بیوی سے محبت کر کیوں کہ وہ اس کی مستحق ہے۔اس کا پیٹ بھر۔اس کی کمر کپڑے سے ڈھانک ،اس کے بدن پر خوشبو مل، جب تک زندہ ہے اس کا دل خوش رکھ کیوں کہ وہ (بیوی) اپنے مالک کے لیے سود مند زمین (کھیتی) ہوتی ہے ۔ جو کچھ تیرے پاس ہے اس سے اس کے دل کو تسکین پہنچا۔ اس طرح وہ تیرے گھر میں رہے گی ۔اگر تو اسے دھتکارے گا تو وہ رونے لگے گی۔''

ایک ایسا مثالی نظام جس کی بنیاد مرد یا عورت میں سے کسی ایک کی برتری و بالا دستی پر مرکوز ہونے کی بجائے مساوی و یکساں اقدار پر قائم ہو۔اس طرح تانیثیت مرد اساس نظام و اقدار کی نہ صرف نفی کرتی ہے بلکہ اس کے بالمقابل مکمل مساوات پر مبنی ایک نئے نظام و وقار کی تعمیر وتشکیل کا عزم بھی ظاہر کرتی ہے، جس کے لیے متعصبانہ ذہنیت و امتیازی فکروں کے حامل افراد کی ذہن سازی ناگزیر ہے۔تانیثی فکر کے علم برداروں کا عقیدہ ہے کہ مروجہ ادبی اقدار، معیار اور پیمانے پدرسری نظام کے پروردہ و پرداختہ ہیں۔ لہٰذا امتیازات وتعصبات پر مبنی عورت کی آزادانہ وجود کی نفی کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی جوہر کی سرکوبی سے عبارت ہے۔جن کے موضوعات جذباتی اور نفسیاتی ردعمل کا مظہر ہیں۔ پدرسری نظام نے بیوی ، بہن ، بیٹی اور کی ماں کی حیثیت سے انھیں پہچانا لیکن انسانی حقوق سے دست بردار رکھا۔ایسے حالات میں تحریکِ نسواں سے جڑی قلم کار خواتین اپنے جذبات، احساسات، تخیلات ، انانیت، اخلاص، ایثار، محبت، شگفتگی اور دل آویزی کے ساتھ اس تحریک کو فروغ دیتی آرہی ہیں۔

عصر حاضر میں تانیثیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ادب و ثقافت کے شعبے میں بھی نہ صرف نمایاں ہے بلکہ وہ عصر جدید میں ادبی و تخلیقی اظہار اور ڈسکورس کا ایک توانا جزو بن چکی ہے ۔ یہ ڈسکورس اتنا وقیع اور ہمہ گیر ہے کہ اسے نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی خارج کیا جاسکتا ہے ۔ زندگی کے دیگر شعبے کی طرح تانیثیت ادبی و تخلیقی سطح پر

بھی ان تمام ادبی معیار و اقدار اور تصورات کو رَد کرنے پر مصر ہے جو مرد اساس نظام اور اقدار کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ جس کے اثرات علوم و فنون کے ہر شعبوں پر مرتب ہوئے۔ بالخصوص اردو ادب کی خواتین قلم کاروں نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا۔ اردو ادب میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، فہمیدہ ریاض، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، شہناز نبی، فرخندہ نسرین، شفیق فاطمہ، ساجدہ زیدی، ترنم ریاض سارہ شگفتہ، بلقیس ظفیر الحسن، رفیعہ شبنم عابدی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صالحہ عابد حسین اور عذرا رحمٰن وغیرہ نے تحریکِ نسوں کو اپنی اپنی تحریروں کے ذریعے فروغ دیا۔ اسی وجہ سے موجودہ تمام اصناف ادب میں تانیثی فکر نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں۔ اس مقالہ میں خواتین قلم کاروں کے منتخبہ ناولوں کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول 'آخر شب کے ہم سفر' (1979) میں نسوانی کردار متحرک و حساس ہیں۔ 'دیپالی سرکار' ناانصافی و ظلم کی شکار بننے کے بجائے اس کے خلاف جانے کا عزم رکھتی ہے۔ دیپالی سرکار تحریک نسواں کی پیش رو بن کر ناول میں ابھرتی ہے۔ مثبت فکر اور مستقل مزاجی نے انھیں فعالیت عطا کی ہے۔ وہ فرسودہ عقائد و رسومات کو ترک کر سماج میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی ہمت رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس یاسمین مجید مصلحت پسندی سے کام نہ لے خودکشی کو گلے لگاتی ہے۔ روزی بھی اپنی خود داری کو برقرار رکھتی ہوئے معافی مانگنے سے انکار کرتی ہے۔ ناصرہ نجم السحر مردوں سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ قرۃ العین حیدر عورت کو مظلومی، مجبوری و محرومی کے دائرے سے نکال کر انقلابی کردار عطا کرتی ہیں۔ جہاں عورت عملی و فکری اعتبار سے ملک کی تعمیر و ترقی میں مردوں کے ساتھ ہے۔ مرد اساس سماج خواتین کی یہ سرگرمی برداشت نہیں کرتا۔

'راجہ گدھ' (1981) میں بانو قدسیہ نے جانوروں کے کرداروں کو انسان کی طرح پیش کیا ہے۔ گدھ انسان کے حرص و ہوس کا علامت ہے۔ گدھ کا خوراک مردار ہے اور اشرف المخلوقات سے جس قدر وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں، وہ قابل افسوس ہے۔ حرام و حلال کے تصور کو بنیاد بنا کر بانو قدسیہ مرکزی کردار سیمی شاہ کے ساتھ متعدد بار مردوں کی مکاری پر ایک فکر انگیز ناول ہے۔ جس میں عورت کے ذہنی و باطنی کرب کو بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ سماج ایک عورت کو طوائف بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن ان حالات میں بھی امتل اپنے نسوانی جذبوں و خصوصیت کو زندہ رکھتی ہے۔ وہ طوائف کے پیشے سے باہر آنا چاہتی ہے۔ ایک باوفا بیوی بن کر زندگی گذارنے کی متمنی ہے۔ ایک طرف سیمی شاہ مردوں کی بے وفائی سے اپنے وجود سے ہی متنفر ہو جاتی ہے اور موت کو گلے لگاتی ہے۔ دوسری طرف امتل اپنی آزادی، زندہ دلی اور خواہش کو برقرار رکھتی ہے۔ اس کا سودا نہیں کرتی خواہ اس عوض میں زندگی کی پُرخار راہوں پر تنہائی مقدر بنے۔ اس کے اندر یہ امید باقی ہے کہ بہتر مستقبل کے ساتھ سماج میں عزت ملے گی۔

'عالم پناہ' (1983) رفیعہ منظور الامین کا دوسرا ناول ہے۔ ناول کا موضوع اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے۔ ناول میں یتیم ایمن کے ذریعے حیدرآباد کی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ ایمن ایک باہمت و با حوصلہ لڑکی ہے۔ مصائب کا سامنا کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ مرد اساس نظام کے سامنے کسی بھی حال میں اپنی خود داری، خود اعتمادی، عزت نفس و شخصیت کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔ جب وہ ملازمت کے لیے عالم پناہ میں انٹرویو میں کامیاب ہو جاتی ہے، اس سے بڑی سرکار پوچھتی ہیں۔ 'کام کے بارے میں تمھیں اندازہ ہے کہ کیا کرنا ہوگا'۔ ایمن جواب دیتی ہے۔ 'میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری خود داری برداشت کرے'۔ ایک تنہا لڑکی کے عزم و احتیاط کو دیکھ کر سامنے والا اپنی حد کا اندازہ کر سکتا ہے۔ رفیعہ منظور الامین بڑی خوب صورتی سے سماج کو پیغام دیتی ہیں کہ لڑکیاں صرف چھوئی موئی کی طرح نازک نہیں ہوتی، وقت و حالات کے سامنے سینہ سپر ہونا بھی جانتی ہیں۔ مرد غالب معاشرہ میں اپنی طرف اٹھنے والی آنکھوں و منصوبوں کا ایمن بڑی بے باکی اور پُر اعتمادی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔

خدیجہ مستور کا دوسرا ناول 'زمین' (1984) تقسیم ہند کے بعد مہاجرین کی زندگی پر محیط ہے۔ مصنفہ چھ متضاد خواتین کردار پیش کرتی ہیں۔ ان میں مرکزی کردار ساجدہ کا ہے۔ جو مرد اساس نظام سے نفرت کرتی ہے۔ ان عورتوں سے بھی ساجدہ شاکی ہے جو مردوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتی ہیں۔ اپنی مدافعت کرنے کے بجائے محبت کے چند رسمی جملوں پر نچھاور ہو جاتی ہیں۔ زمین میں ساجدہ کے علاوہ سبھی کردار کسی نہ کسی طور سے مردوں کے دام میں پھنسی ہیں۔ ثانوی کردار میں تابی ہے۔ جو کاظم کے جنسی جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتی۔ اسے متعدد بار اپنے بچے کے وجود کو دنیا میں لانے سے پہلے ہی ختم کرنا پڑتا ہے، اس پر بھی وہ خلاابی سے کوئی باز پرس نہیں کرتی۔ اور ستم ہائے ستم یہ کہ تابی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔

'بارش سنگ' (1985) میں جیلانی بانو سرمایہ دارانہ جاگیردار

نظام میں عورتوں کے ساتھ روا ناروا سلوک کو موضوع بناتی ہیں ۔ جابر و ظالم نظام میں خواتین ،مزدور، کسان، مجبور ولاچار ہیں ۔عصمت دری کی درد انگیز کہانی ہے۔ دولت و طاقت خواتین کے پاک دامنی کو چاک کر رہی ہیں ۔ وہ تمام برائی و مسائل تانیثیت جن کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے، جیلانی بانو کے ناول میں کم و بیش نظر آتے ہیں ۔صغرا مہدی نے ناول 'راگ بھوپالی' (1985) میں خارجی حقیقت کے بجائے داخلی حقیقت کو پیش کیا ہے ۔ ناول میں اہم کردار رابعہ کافی جاندار ہے ۔ جو تعلیم یافتہ، روشن خیال ،ذہین و زندہ دل ہے ۔صغرا مہدی عورت کے ذہنی و جذباتی سفر کو فنی انداز میں پیش کرتی ہیں ۔عمومی طور پر عورت کی ازدواجی زندگی میں ناہمواری اور ہم آہنگی نہ ہونے سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے ۔رشتوں کے ٹوٹنے کا کرب ساری زندگی ایک درد دے جاتا ہے ۔ رابعہ شوہر سے علاحدگی کے بعد اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی سے اپنے وجود کو بکھرنے نہیں دیتی ۔وہ خود دار، خود کفیل بن کر معاشرے کو ایک مثبت پیغام دیتی ہے ۔معاشرے کی دوسری عورتوں کو تنہائی سے نکلنے اور اپنی مدد آپ کرنے پر راغب کرتی ہیں ۔

'چاندنی بیگم' (1990) کا موضوع بھی زندگی، زمانہ، زمین، وقت اور موت ہیں اور وقت کے سیل رواں میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اتھل پتھل اور انسان کے خوابوں اور منصوبوں کی بے ثباتی ہی ہیں۔ چاندنی بیگم کا کردار کافی سیدھا سادہ ہے۔ وہ ایک رئیس خاندان کی غریب اولاد ہے۔ جسے اس کی بدنصیب اور خود دار ماں نے بڑی مصیبت سے پالا ہے اور بڑی مشکل سے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ وہ ایم۔اے، بی ٹی ہے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی ماں کے ساتھ ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھا رہی ہے اور کالج کی پرنسپل جو اس کی مالک بھی ہے دل بھر کر دونوں ماں بیٹیوں کا استحصال کر رہی ہے۔ چاندنی بیگم کو بٹو بیگم نے قنبر علی کے لیے پسند کر لیا تھا کیوں کہ وہ قنبر علی کی تینوں شرطوں پر پوری اترتی ہے یعنی غریب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ بہت خوبصورت بھی ہے۔ لیکن ان کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوتا اور ان کے ساتھ ہی قبر کی تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔

□□□

Naaz Aafreen
Senior Research Scholar
Dept.of Urdu,
Ranchi University
Ranchi.834009 (Jharkhand)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ رمنی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے ۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpul.in

دستخط

ایم اے کنول جعفری

پنچایتوں میں خواتین کا کردار

اپریل1995 میں منعقد ہونے والے سہ سطحی پنچایت انتخابات میں خواتین کے لئے 33 فیصدی رزرویشن دیے جانے کے بعد یہ اُمید کی جارہی تھی کہ گاؤں پنچایت کی پردھان وممبران، بلاک پرمکھ وبلاک پنچایت کے ممبران اور ضلع پنچایت کے صدروضلع پنچایت کے ممبران کی شکل میں الیکشن جیت کر اپنے عہدوں پر فائز ہونے والی خواتین مردوں کی طرح اپنے حقوق کا استعمال کر خدمتِ خلق کے ساتھ اُن سبھی ترقیاتی امورکوبخوبی انجام دے سکیں گی، جو73 ویں اور 74 ویں ترمیمی بل 1992 کے تحت اُنہیں حاصل ہوئے ہیں۔لیکن23برس کے طویل کام کاجی عرصہ پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی حقوق حاصل ہونے کے باوجود کتنی ہی عورتیں فیصلہ لینے میں خودکفیل نہیں ہوکر ابھی بھی مردوں کی محتاج ہیں۔ڈنکے کی چوٹ پر سیاست کرنے اور اقتدار کی تکمیل ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنے والے مرد اساس معاشرے کی نفسیاتی سوچ کی قبولیت کا اندازہ اِسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کی آدھی آبادی کے لئے اُس نے50فیصدی تعاون کے مقابلہ صرف 33فیصدی خواتین کے لئے رزرویشن کو قبول کیا،جبکہ پارلیمنٹ میں خواتین ممبران کی کم سے کم تعداد177ہونے سے متعلق بل ابھی بھی منظوری کی راہ دیکھ رہا ہے۔

حالانکہ یو پی اے سرکار کی جانب سے27اگست2009میں پنچایتی راج کے تحت کام کرنے والی پنچایت اکائیوں کے لئے خواتین کا کوٹہ 50فیصدی مختص کئے جانے کومنظوری دی گئی،لیکن اس سے قبل ہی مدھیہ پردیش، بہار، اُتراکھنڈاور ہماچل پردیش میں سہ سطحی پنچایتوں کے لئے آدھی سیٹیں عورتوں کے لئے رزرو کی جاچکی تھیں۔ بعدمیں کئی دیگر صوبوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ 25نومبر2011 کوآندھر پردیش، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، کیرالہ،مہاراشٹرا، اُڑیسہ، راجستھان اور تریپورا میں خواتین کے لئے50فیصدی کوٹہ مختص کیا گیا۔ گزشتہ سہ سطحی پنچایتی

الیکشن میں ہماچل پردیش کی کارکردگی کو بھی لائق ستائش اور قابل تقلید کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ چناؤ میں 3226 پنچایتوں میں 1638 پر خاتون پردھانوں کا قبضہ ہے، جبکہ مرد پردھانوں کی تعداد 1588 ہے، جو خواتین سے 50 کم ہیں۔ 250 ضلع پنچایت ممبران میں مردوں کی تعداد 123 اور مستورات کی 127 ہے، جبکہ 1673 بلاک سطحی پنچایت کے ممبران میں عورتوں کی تعداد 862 اور مردوں کی 811 ہے۔ دسمبر 2015 میں اُتر پردیش میں 74 اضلاع میں سہ سطحی پنچایت الیکشن کرائے گئے۔ ایک پنچایت میں بعد میں چناؤ ہوا۔ 58,658 پنچایتوں میں 72 فیصدی رائے دہندگان نے اپنی رائے کا استعمال کیا۔ 33 فیصدی کے طے شدہ کوٹے سے 11 فیصد زیادہ خاتون منتخب ہوئیں۔ 43.86 فیصدی عورتوں نے کامیابی حاصل کی۔ حالانکہ الیکشن میں 15.44 فیصدی خواتین ناخواندہ ہیں، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ 18 پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈروں میں 04 عورتیں پی ایچ ڈی کی ڈگری لئے ہوئے ہیں۔ 2.09 فیصدی پوسٹ گریجویٹ، 6.12 فیصدی گریجویٹ، 6.40 فیصدی انٹر میڈیٹ، 7.43 فیصدی ہائی اسکول، 13.23 فیصدی درجہ آٹھ اور 49.28 فیصدی درجہ پانچ پاس ہیں۔ مردوں میں یہ تناسب زیادہ ہے۔ 4.8 فیصدی مرد پوسٹ گریجویٹ، 13.72 فیصدی گریجویٹ، 15.36 فیصدی انٹر میڈیٹ، 14.71 فیصدی ہائی اسکول، 13.53 فیصدی درجہ آٹھ اور 32.81 فیصدی درجہ پانچ پاس ہیں۔ منتخب مردوں میں 5.02 فیصدی ناخواندہ بھی ہیں۔ جہاں تک ضلعوں کا تعلق ہے، سنبھل میں سب سے زیادہ 54.50 فیصد، رام پور میں 54.44 فیصد، مرادآباد میں 51.00 فیصد، بدایوں میں 50.50 فیصد، بہرائچ میں 49.60 فیصد، ہاتھرس میں 38.00 فیصد، متھرا میں 36.70 فیصد اور آگرہ میں 37.00 فیصد خواتین منتخب ہوئیں۔

کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے آئین میں خواتین کو مردوں کے مساوی اختیارات حاصل ہیں، لیکن مردانہ اجارہ داری کے سبب ہر زمرے میں اُن کی حیثیت آج بھی دوئم درجہ کے شہری جیسی ہی ہے۔ معاشرتی نقطۂ نگاہ سے بڑی حد تک فراموش کی جانے والی مستورات سیاست کے میدان میں بہت پیچھے اور گئی گزری ہیں۔ گھر اور گھر کے باہر مردوں کا ہی راج ہے۔ سماج کے ایک بڑے طبقہ میں اہلِ خانہ کے لئے کھانا تیار کرنے والی عورت کو مردوں سے پہلے کھانا نوش کرنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ زیادتی یہ بھی ہے کہ مرد تازہ کھانا تناول کرتا ہے، جبکہ خواتین کے حصہ میں باسی، بچا ہوا اور روکھا سوکھا کھانا آتا ہے۔ مرد کی خدمت خاتون کا مذہب اور عورت پر ظلم مردوں کا حق تصور کیا جاتا ہے۔ بات بے بات کے دماغی سرزنش اور جسمانی ایذا مردوں کا وطیرہ ہے۔ ظلم پر ظلم برداشت کرنے والی خاتون کی قدر و منزلت نہ تو گھر کے اندر ہی مستحکم ہو سکی ہے اور نہ ہی گھر کے باہر کسی حد تک بہتر ہوئی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا میدان ہو یا نوکری حاصل کرنے کا زمرہ، عورت کا مقام مردوں کے بعد ہی متعین کیا جاتا ہے۔ سیاست میں خواتین کو مواقع دئے جانے کی باتیں تو بہت کی جاتی ہیں، لیکن مردانہ قوت و اجارہ داری والے معاشرے کی تنگ ذہنیت کی وجہ سے سیاست میں خواتین کے حقیقی مقام کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ ہندوستانی عورتوں کے ذریعہ معاشرے میں نمایاں کردار ادا کرنے میں سب سے بڑی رُکاوٹ گھر کے افراد ہی پائے جاتے ہیں۔ چاہے گاؤں کی چھوٹی سی پنچایت ہو، یا علاقائی (بلاک) بڑی پنچایت، ضلع کی پنچایت ہو یا سرکاری، نیم سرکاری یا نجی دفاتر، سب جگہ مردوں کا رویہ خواتین کے ساتھ تعاون کرنے والا نہیں ہوتا۔

گاؤں پنچایتوں کے حقوق، کام اور ذمہ داریوں میں زمین، کھیتی و باغبانی ترقی، مویشی پروری، دودھ انڈسٹری، چھوٹے، کُٹیر و دیہاتی دھندے، پینے کا پانی، سڑک، بجلی، تعلیم، تکنیکی ٹریننگ و کاروباری تعلیم، بزرگ و غیر رسمی تعلیم، بزرگ خواندگی، لائبریری کا انعقاد، حفظان صحت و صاف صفائی، خاندانی بہبود، عوامی اشیاء تقسیم کا نظام، بنجر و چراگاہ کی ترقی و تحفظ، معمولی آبپاشی، آبی مینجمنٹ اور آبی احاطہ و ترقی، مرغ و ماہی پروری، معاشرتی شجرکاری، معمولی جنگل کی مصنوعات و افزائش، دیہی مکانات، ایندھن، پُلیا، پُل و آمدورفت و ذرائع ابلاغ، غربت کا خاتمہ، دیہی آرٹ و کرافٹ، بازار و میلہ، کھیل کود و ثقافتی افعال، انسانی و مویشی ویکسی نیشن، جنم، انتقال و شادی کا رجسٹریشن، اقتصادی ترقی کی منصوبہ بندی، زچگی و بچہ کی ترقی، معاشرتی فلاح و بہبود، بزرگ، بیوہ و معذور پنشن، کمزور، درج فہرست ذات و درج فہرست قبائل، فلاح اور قومی اثاثوں کا تحفظ وغیرہ شامل ہیں۔

مرد شناخت اور مرد غالب معاشرے کے علمبردار تعلیم یافتہ اور قابل گاؤں پردھان مرد بھی جب گاؤں پنچایتوں کو حاصل حقوق کی پامالی کریں اور عوامی تقسیم کاری اسکیم، خاندانی منصوبہ بندی، تعلیم، تعلیمِ بالغان، خواندگی، طب، ٹیکا کاری، بجلی، صاف صفائی، پینے کا صاف پانی اور کھیتی ترقی جیسے اہم کاموں کے تئیں اپنی دلچسپی نہیں رکھنے کی وجہ سے دیہات کے لوگوں کی خدمات کو انجام نہیں دے سکتے، تب دن میں کئی

بار باورچی خانہ کا استعمال کرنے میں اور دیگر امور خانہ کو انجام دینے والی خواتین پردھانوں کے ذریعہ ایسے اہم کاموں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی امید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟ جبکہ گاؤں کی صدر (پردھان) اور ممبران کو تربیت دئے جانے کے بہتر مواقع تک حاصل نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر 1998 کے تین سطحی شروعاتی پنچایت الیکشن میں سیما پروین اُتر پردیش کے ضلع بجنور کے سب سے بڑی آبادی کے گاؤں نیندڑو خاص کی پردھان منتخب کی گئی تھی۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم یافتہ خاتون میں کام کرنے کی صلاحیت کے ساتھ عوامی خدمات کا قوی جذبہ موجود تھا، لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اُنہیں پانچ برس تک دو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو وہ پردہ نشین تھی، دوسرے شوہر پنچایت میں نائب پردھان کے عہدے پر فائز تھے۔ تعلیم یافتہ شوہر کے ذریعہ پنچایت سے متعلق سبھی کام کاج خود کرنے کو اپنا بنیادی حق سمجھ لینے کی غلط روش کی وجہ سے خاتون پردھان کچھ نہیں کر سکی۔ اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ گاؤں پنچایت کی عام میٹنگ میں تو کیا، پنچایت کے پندرہ ممبران کی خصوصی میٹنگ میں شمولیت اور اس کی کارروائی سے بھی محروم رہی۔ حالانکہ میٹنگ رجسٹر میں بطور پردھان ان کے دستخط دیکھنے سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ وہ ہر میٹنگ میں بذاتِ خود شامل رہی ہے۔ یہی حال خواتین ممبران کا رہا ہے۔ کارروائی رجسٹر پر ان کے دستخط یا انگوٹھہ نشان لگانے کا کام صدر کے ذریعہ ان کے گھر پر جا کر ہی کرایا جاتا رہا ہے۔ بلاک، تحصیل یا ضلع سطحی میٹنگوں میں خواتین صدر یا ممبران کی جگہ ان کے شوہر، بھائی یا بیٹے ہی شرکت کرنے سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پنچایت کے کام سے سرکاری یا نیم سرکاری دفاتر میں جانے آنے کی ذمہ داری بھی زیادہ تر شوہر ہی اُٹھاتے ہیں۔ بلاک پرمکھ کے عہدے پر رہی تعلیم یافتہ مالا دیوی دفتر میں بیٹھ کر لوگوں کی پریشانیوں کو سُنتی تھی، لیکن بڑے فیصلے شوہر ہی کرتے تھے۔ ضلع پنچایت کی ممبر رہی تعلیم یافتہ یاسمین فاطمہ کا کام صرف ضلع پنچایت کے صدر کا انتخاب کرنے یا حذبِ مخالف کے ساتھ ووٹ ڈالنے تک ہی محدود رہا۔ تعمیراتی امور کے فیصلے شوہر کے ذریعہ ہی کئے گئے۔ معظم پور سورج کی پردھان سنیتا دیوی پردہ نہیں کرنے کی وجہ سے میٹنگوں میں تو شرکت کرتی رہی، لیکن کمان شوہر کے ہاتھ میں ہی رہی۔ محمد علی پور بھیکن کی اَن پڑھ پردھان نسیمہ خاتون ضرور الگ ثابت ہوئی۔ اپنی نامزدگی کرانے کی ہمت بڑھانے کے لئے شوہر نے ان کی پٹائی کی تھی، لیکن وہ سرکار کے ذریعہ دئے گئے حق کا صحیح استعمال کرنے کے لئے ہر میٹنگ میں بے جھجک شرکت کرنے کو لازمی سمجھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں دفتروں میں حاضر ہو کر افسران تک لوگوں کی بات پہنچا کر ترقیاتی کام کرانے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اس کے برعکس زیادہ تر پردھان (صدر) یا ممبران میں وہ چاہے مورتی دیوی ہو یا ریکھا رانی، نعیمہ خاتون ہو یا کیلاشو دیوی، دُلاری دیوی ہو یا سُشیلا کماری، پرمیشوری دیوی ہو یا ساجدہ خاتون، اپنے حقوق کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکیں۔ ان نام نہاد خواتین پردھان یا ممبران کا کام کاج مرد حضرات ہی کرتے رہے۔ اس حالت میں آج بھی بہت زیادہ تبدیلی نہیں آپائی ہے۔

آدھی آبادی کے سیاسی حالات کی بے بسی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ قانون نفاذ کے 26 برس گزر جانے کے بعد بھی 95 فیصدی سے زیادہ خواتین پردھانوں کو ایجنڈا تیار کرنے، ربی اور خریف کی فصلوں کے مواقع پر سال کی دو اہم میٹنگ کرنے، ماہواری یا ضرورت کے حساب سے بُلائی جانے والی بیٹھک کا انعقاد کرنے، میٹنگ میں قرارداد پیش کرنے کا طریقہ یا کورم پورا نہیں ہونے کی صورت میں

میٹنگ کو ملتوی کرنے تک کی جانکاری نہیں ہے۔ان تمام معاملات سے واقف گرام پنچایت افسر (سکریٹری) جس طرح چاہتا ہے، رجسٹر میں کارروائی درج کر دیتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جن خواتین پردھانوں یا ممبران کے شوہر، بھائی، والد یا بیٹے ماضی میں ان عہدوں پر کام کر چکے ہیں، ان کے سامنے مقابلتاً دقتیں کم آتی ہیں۔

خواتین پردھانوں سے متعلق مردوں کے ذریعہ رجسٹر میں کارروائی کا اندراج کرنے، دفاتر میں جاکر افسر اور کلرکوں سے بات چیت کر عوامی شکایات کا تصفیہ کرانے یا گاؤں وعلاقہ میں تعمیراتی کام خود کرانے کے سبب خواتین پردھانوں کی سابقہ یا موجودہ زندگی میں کوئی واضح فرق نہیں آیا ہے۔ انہیں آج بھی پہلے ہی کی طرح اُمور خانہ کو انجام دینا اور پردے کی وجہ سے چہار دیواری کے اندر مقید رہنا پڑتا ہے۔ دوسری جانب نسیمہ خاتون جیسی اَن پڑھ، کم پڑھی لکھی یا بیوہ خاتون پردھان کے سامنے زیادہ دقتیں آتی ہیں۔ انہیں مرد اکثریت والے دفاتر و اداروں میں بے وقوف بنانے کے ساتھ مطلب برآری کی ناپاک کوششیں تک کی جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں مرد عہدیداروں کے ذریعہ تعاون نہیں کرنے کی شکایتیں کرتی ہیں۔ یہ دقت خواتین پردھان، بلاک پرمکھ، ضلع صدر یا ممبران کی ہی ہو، ایسا نہیں ہے۔ ملک کی کروڑوں ناخواندہ مستورات، مردوں کے غیر تعاون اور ان کے ذریعہ پیدا کئے گئے مسائل سے بے حد پریشان ہیں۔

ملک کے آئین پر نظر ڈالیں، تو پایا جاتا ہے کہ کسی بھی مذہب اور فرقہ کے مرد وزن کو جہاں سماجی، سیاسی، تعلیمی، طبی، عدالتی، تصوراتی، عزت اور اظہار خیال کی آزادی جیسے تمام معاملات میں یکسانیت کے حقوق حاصل ہیں، وہیں مذہب و عبادت کی بھی مکمل طور پر آزادی حاصل ہے۔ موجودہ دور میں جہاں تک خواتین کا تعلق ہے، زندگی سے متعلق کوئی بھی زمرہ، علاقہ یا ادارہ ایسا نہیں ہے، جہاں عورتوں کی موجودگی نہ پائی جاتی ہو۔ خواتین کا تعلیم وطب کے محور سے باہر نکل کر خلاء تک میں پرواز کرنے کی خوش قسمتی جہاں ملک کے عوام کے لئے فخر کی بات ہے، وہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاست کو اپنی مٹھی میں قید رکھنے والا مردانہ فوقیت غرور خواتین کے حقوق اور مسائل کو پوری طرح نظر انداز کرتا آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پالیمنٹ میں 33 فیصدی خواتین ممبران ہونے کی وکالت کرنے والی سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ کے الیکشن میں اس نسبت کو برقرار نہیں رکھ سکیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں رزرویشن کی بدولت منتخب ہو کر آنے والی خواتین نہ صرف ملک کی آدھی آبادی کی نمائندگی کرتی ہیں، بلکہ مستورات کی پریشانیاں اور مسائل کے تئیں بھی کافی حد تک ہوشیار رہ کر ملک وقوم کی ترقی میں اپنا تعاون پیش کرنے سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس نظم سے لوکل سیلف گورنمنٹ میں تینتیس فیصدی رزرویشن کی طاقت پر گاؤں، بلاک و ضلع پنچایتوں کی خدمات کی ذمہ داری حاصل کرنے والی خواتین کو بھی فیض پہنچا، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مردوں کی مخالفت کے سبب یہ رزرویشن بل ابھی تک زیر التوا پڑا ہوا ہے۔

دراصل، مرد غالب معاشرے کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس ماحول میں خاتون اپنی موجودگی درج کرانے اور کچھ کر دکھانے کی جرأت یا خود پہل نہیں کر پاتی اور اکثر مرد بیساکھی کا سہارا ڈھونڈتی رہتی ہے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے انتخابات میں بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ پردھان، ممبران، بلاک پرمکھ اور ضلع صدر کی رزرو سیٹوں سے الیکشن لڑنے والی خواتین امیدوار کسی نہ کسی طرح اپنی نامزدگی تو کرا آتی ہیں، لیکن انتخابی مہم کے دوران ووٹوں کی طلب اور کنونشن کے لئے گھروں سے باہر نہیں نکل پاتیں۔ مرد ہی ان کا الیکشن لڑاتے ہیں۔ فتحیاب ہونے پر بھی یہ گھر کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکلتیں۔ متعلقہ مرد اپنے جلوس نکال کر بے حد خوش دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کو انتخابی مہم چلانے یا حکمتِ عملی خود بنا کر اُس پر عمل کرنے کرانے کی چھوٹ نہیں ہونے کی وجہ سے خواتین محض مردوں کا مہرہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے باوجود پنچایت سے متعلق کوئی کام کرنے یا فیصلہ لینے کی آزادی اُنہیں آج بھی حاصل نہیں ہے۔ اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ آئین تو خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق دیتا ہے، لیکن کوئی بھی فیصلہ پنچایت کی خاتون صدر کا شوہر، بیٹا، باپ یا بھائی لیتا ہے۔ عہدۂ خاص کے لئے منتخب ہونے والی مستورات مرد حضرات کا مہرہ یا مہر بن کر رہ گئی ہیں۔ کہیں مرد خاتون کو ڈھال یا مہرہ بنا کر مطلب نکالتا ہے، تو کہیں اُس کی مہر کا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

پنچایتی اداروں میں خواتین کے تعاون کی رفتار تیز تر کرنے کے لئے موجودہ حالات میں تبدیلی لانا بہت ضروری ہے، لیکن اس طرح کی کوششوں کو صمیم القلب اور پوری ایمانداری کے ساتھ کیا جانا لازمی ہے۔ دقیانوسی معاشرتی نظریات میں تغیر کے لئے خواتین کو نہ صرف خود آگے آنا ہوگا، بلکہ معاشرے کو یہ بھی باور کرانا ہوگا کہ وہ امور خانہ میں جتنی کامیاب ہیں، گھر کے باہر سیاسی میدان میں بھی اُتنی ہی مقصد ور خاتون ہیں۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ مرد کسی خاتون کو آسانی سے اپنی قابلیت کے

جوہر دکھانے کے مواقع دینے میں فراخ دل نہیں ہے۔ مستورات کو مردوں کا یقین جیتنا ہوگا اور اپنے حقوق اور مواقع کی حصولی کے لئے اپنی کوششوں کو رفتار دینی ہوگی۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر خاتون اپنے حقوق کے تئیں لاپرواہی برتتی ہے، تب وہ اپنی ذمہ داری اور ڈیوٹی کے لئے بیدار کیسے ہوسکتی ہے؟

جاننے کی فکر اور کوشش کے بغیر کوئی بھی عورت جواہر روزگار گارنٹی اسکیم، زچگی کی فلاح و بہبود، دودھ کی ترقی، اندرا مکانات، پنشن، سماجی فلاح و بہبود، خاندانی فلاح و بہبود، جیسی منصوبہ بندی اور خواندگی و پلس پولیو وغیرہ قومی اسکیموں کی جانکاری کیا حاصل کرسکیں گی۔ خواتین معاشرے اور دیہی عوام کو مفاد عامہ کی اسکیموں اور پروگراموں کے بارے میں کس طرح معلومات مہیا کراسکیں گی؟ گاؤوں میں تعلیم، صحت، صفائی، پینے کا صاف پانی، چراگاہ، آلودگی اور شاہراہ سے متعلق مسائل رہتے ہیں۔ اُن کے بروقت حل کے لئے خاتون چیئر پرسن اور ممبران کا بیدار رہنا لازمی ہے۔ گاؤں، بلاک و ضلع سطحی پنچایتوں میں تعلیم کمیٹی، خواتین اور اطفال فلاح و بہبود کمیٹی، منصوبہ بندی کمیٹی اور سماجی انصاف کمیٹی کی تشکیل دئے جانے کا قانون ہے، تاکہ دیہی ترقیات کے مختلف مقاصد کو پورا کرنے کے لئے صلاح و مشورہ کیا جا سکے۔ مکمل جانکاری نہیں ہونے کی وجہ سے ناخواندہ خواتین، مرد افسران اور دفاتر میں کام کرنے والے کلرکوں کے ہاتھوں کی کٹھپتلی بن جاتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کچھ ناخواندہ پردھان عورتوں اور ممبران نے اپنے دستخط کرنے سیکھ لئے ہیں، لیکن صرف دستخط کر لینے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ سرکاری و غیر سرکاری کاغذات، کارروائی رجسٹر کی قرارداد اور مہر لگنے کے لئے آنے والے اہم کاغذات میں کیا تحریر ہے، یہ پڑھنا بھی تو آنا چاہئے؟

مرد کے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی پر ٹکی خاتون سیاست کو موقوف کر عورتوں کو اپنے طریقہ سے کام کاج انجام دینے کے لئے جہاں مردوں کی مداخلت کو ختم کیا جانا لازمی ہے، وہیں خواتین کو اپنے کام کاج میں ماہر بنانے کے لئے انہیں تربیت دیا جانا بھی ضروری ہے۔ خواتین کے اندر پائی جانے والی جھجک دُور کرنے کے لئے خواتین افسران کی مدد حاصل کرنا مناسب رہے گا۔ ٹریننگ کا کام مقامی سطح پر کیمپ لگا کر کیا جانا چاہئے، تاکہ خواتین ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کرسکیں۔ ٹریننگ کے ذریعہ سرکاری اسکیم اور فریم ورک، جن سے عام آدمی کا تعلق ہوسکتا ہے کی مکمل جانکاری دی جانی چاہئے۔ مختلف زمروں کی موٹی موٹی اور اہم معلومات خواتین صدر و ممبران اپنے اپنے علاقے میں فلاح و بہبود کا کاموں کو رفتار دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوسکیں گی۔ ایسی عورتیں سرکاری عملہ و افسران پر ترقیاتی امور کے نفاذ کے لئے دباؤ بھی ڈال سکیں گی۔ دیہات کے لوگوں کو سرکاری سستے غلہ کی دُکانوں سے پورا گیہوں، چاول، چینی، مٹی کا تیل، دالیں و دیگر ضروری اشیا کے ساتھ ساتھ کوآپریٹو سوسائٹیوں سے عمدہ قسم کا بیج و کھاد وغیرہ مقررہ قیمت پر مہیا کراسکیں گی۔ اسکولی بچوں کو صاف ستھرے مڈ ڈے میل، یونیفارم، کتابیں و بیگ وغیرہ کے ساتھ انہیں سرکاری وضائف کی تقسیم بھی بروقت کراسکیں گی۔ اتنا ہی نہیں باہمت خواتین عام لوگوں کو پولیس کی زیادتیوں سے بچانے میں بھی اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

خواتین کو ان کے حقوق کے تئیں بیدار کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جب تب دی جانے والی تربیت کے علاوہ ترقیاتی کام کاج سے متعلق اجلاس و سیمناروں میں پردھانوں اور ممبران کی حاضری یقینی بنائی جانی چاہئے۔ اتنا ہی نہیں بلاک پنچایت کی ماہواری میٹنگ یا دیگر ترقیاتی پروگرام میں خواتین صدور اور علاقائی ممبران اور اسی طرح ضلع پنچایت کی میٹنگوں میں خواتین ضلع پنچایت ممبران کی جگہ ان کے شوہروں کی شامل ہونے کے غلط اور ناجائز رجحان پر بھی قدغن لگایا جانا چاہئے۔ میٹنگوں میں جہاں پنچایت کی خاتون پردھان اور ممبران کی حاضری کو لازمی بنایا جانا چاہئے، وہیں انہیں شناختی کارڈ دے کر افسران و متعلق اہلکاروں کے ذریعہ پہچان کرنے کی اجازت دینے کو یقینی بنایا جانا بھی ضروری ہے۔ ایسا کرنے سے مرد حضرات خود کو گاؤں پردھان، بلاک پرمکھ یا ضلع صدر بتا کر جب تب تبادلہ ہوکر آنے والے نئے افسران کو ورغلانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ اگر خواتین کے آئینی حقوق میں اڑنگے بازی نہ کی جائے، تو وہ اپنی سیاسی، سماجی، تعلیمی، تعمیری اور تخلیقی کارکردگی سے اپنی موجودگی کا احساس کرانے کی قوت ہی نہیں رکھتی، بلکہ انفرادی سوچ کی بدولت کئی قسم کے کارہائے نمایاں انجام دینے کی سکت بھی رکھتی ہیں۔ ہمیں کھلے ذہن سے انہیں اُن کی آزادی دینی ہوگی۔ یہ مرد ذات کی عنایت نہیں، بلکہ خاتون کا بنیادی و آئینی حق ہے۔

M. A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid,
NEENDRU, Tehsil Dhampur
Distt. Bijnor (U.P.) 246761

ایک عرب خاتون کا سفرِ نامۂ ہند

ہمارا وطن عزیز ہندوستان زمانۂ قدیم سے ہی سیاحوں اور راہ نوردوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے خواہ اس کی وجہ اس ملک کی وسعت مکانی اور قدرتی مناظر ہوں یا وسعت قلبی ، رواداری اور گنگا جمنی تہذیب ہو۔ بہر حال یہ سیاحین عالم کے لئے ہمیشہ ایک پر کشش ملک ثابت ہوا ہے۔ ان غیر ملکی سیاحوں نے جہاں ہمارے ملک کے اقتصادی نظام کو فائدہ پہنچایا، وہیں ان میں سے ایک خاصی تعداد نے اپنی اپنی زبان کے ادبی سرمایہ میں بھی اضافہ کیا اور 'سیاحتی ادب' کی آبیاری کی ۔ سیاحوں اور سفرنامہ نویسوں کے اس زمرے میں یوروپی و یونانی اور عرب و غیر عرب سب ہی شامل ہیں ۔ ہر زبان ان کے سیاحتی تجزیوں اور سفرناموں سے مالا مال نظر آتی ہے۔

سیاحتی روداد اور سفرنامے خواہ وہ کسی خطے یا کسی ملک کے ہوں عموماً دلچسپ اور پر کشش ہوتے ہیں خصوصاً جب بات وطن مالوف کی ہو تو ان سفرناموں کی جاذبیت اور مقناطیسیت میں کئی گنا اضافہ ہو جانا فطری بات ہے کیونکہ نگاہ غیر سے اپنے ملک کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور دیگر حالات کا مشاہدہ کرنے کا لطف ہی الگ ہوتا ہے اور جب چشم غیر ادیب و ناقد ہو تو وہ مشاہدہ کے وقت چشم غائر بن جاتی ہے اور قارئین کے لئے مطالعہ کی لذت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ روز و شب کے تمام مانوس مناظر یک سر تبدیل ہو جاتے ہیں، غیر محسوس اشیاء محسوس ہونے لگتی ہیں، غیر مرئی اور جامد امور مرئی اور متحرک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر لفظ اور ہر جملہ تاریخی دستاویز اور ہر واقعہ عبرت و نصیحت کا ایک مستقل باب محسوس ہونے لگتا ہے یعنی یہ سیاحتی شہ پارے نہ صرف قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان ہوتے ہیں بلکہ فکر میں کشادگی اور ذہنی ارتقاء کا باعث بھی ہوتے ہیں۔

"رحلاتی فی العالم" ایک عرب خاتون ڈاکٹر نوال سعداوی کی تصنیف کردہ ہے۔ جس میں ان کے دیگر اسفار عالم کے ساتھ ساتھ ایک مکمل و مفصل باب ہندوستان کے سفر و قیام کے دوران حاصل شدہ تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر نوال سعداوی 27 اکتوبر 1930 میں قاہرہ کے مضافات میں واقع ایک قصبہ کفرطحلہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قاہرہ یونیورسٹی سے 1955 میں طب کی تعلیم مکمل کی۔ موصوفہ پیشہ سے ڈاکٹر لیکن صفات سے محقق اور سماجی کارکن ہیں۔ آزادیٔ نسواں کی علم بردار ہیں لہذا اپنی آواز کو ایک رسالہ "الصحۃ" کی شکل میں عوام تک پہنچانے کی کوشش بھی کر چکی ہیں لیکن حکومت کو ان کی آراء سے شدید اختلاف ہوا نتیجتاً محض تین سال کی عمر پا کر یہ رسالہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ موصوفہ کو پابند سلاسل بھی کیا گیا حتی کہ کچھ سیاسی اور دینی تنظیموں نے آپ کو سزائے موت دلوانے کی بھی سازشیں کیں لیکن ڈاکٹر نوال کے عزم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھنا تو بہت پہلے ہی شروع کر دیا تھا 1957 میں آپ کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'تعلمت الحب' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اب جب حالات نامساعد ہوئے اور فضا میں اختلاف بڑھا تو آپ کے قلم میں بھی روانی آ گئی ادبیات کے ساتھ ساتھ سماجیات کو بھی اپنا موضوع بنا لیا اب تک آپ کی ۴۰ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور دنیا

کی کم وبیش 35 زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی اکثر تحریروں کا موضوع عورت، انسان اور مختلف فیہ سماجی روایات ہے۔ ڈاکٹر نوال کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں: أوراق حیاتی، المرأة والجنس، مذکراتی فی سجن النساء، سقوط الامام، تعلمت الحب، کسر الحدود اور قضیة المرأة المصری وغیرہ

ہر چند کہ ڈاکٹر نوال ایک متنازع فیہ شخصیت کی حامل ہیں۔ بحیثیت ادیبہ وہ ممتاز ہیں لہذا ان کی شخصیت کے متنازع فیہ پہلوؤں سے صرف نظر ہم صرف ان کے مشہور سفرنامہ 'رحلاتی فی العالم' جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان سے متعلق ہے پر ہی تبصرہ کریں گے۔ یہ سفرنامہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ ڈاکٹر سعداوی کے دیگر اسفار عالم کی روداد بھی ہے لیکن اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں قیام وحضر پر مشتمل ہے اور اس وقت وہی ہمارا مطمح نظر ہے۔ ڈاکٹر نوال اندرا گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہندوستان ایک انٹرنیشنل اور کچھ نیشنل سیمینارز میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں۔ یہاں اپنے قیام کے دوران انہوں نے نہ صرف مذکورہ علمی مجالس میں شرکت کی بلکہ ہندوستانی ادیان وآداب کا بڑی دلچسپی سے مشاہدہ ومطالعہ بھی کیا اور بحیثیت ادیبہ وناقدہ اپنے تجربات کو اس سفرنامے میں رقم کر دیا۔

ہندوستان کی تہہ در تہہ تہذیب وثقافت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ڈاکٹر نوال نے جو راستہ اختیار کیا وہ یہ تھا: ''میرے خیال میں ہوائی جہاز کا سفر، عجائب خانوں اور میوزیمز کے مشاہدے اور مہنگے ہوٹلوں میں قیام و طعام اصل سیر وسیاحت نہیں ہے بلکہ سیاحت کی اصل روح مقررہ مقام کے گلی کوچوں کی خاک نوردی سے اور وہاں کے باشندوں سے گفت وشنید کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔''

سرزمین ہند میں ڈاکٹر نوال ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوئی تھیں لہذا اپنے ملک کے مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اپنے وطن سے موازنہ بھی کرتی رہیں۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سرزمین کبھی اپنے وطن مالوف مصر سے بڑی مشابہہ محسوس ہوتی تو کبھی یکسر مختلف، کبھی یہاں کے افراد اور آثار وشعائر میں انہیں مصر اور اہالی مصر نظر آتے تو کبھی یگانگت کا احساس ہوتا۔

ڈاکٹر نوال نے ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک متعدد شہروں، اضلاع اور ریاستوں کا دورہ کیا اور حتی الامکان ان کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کی کوشش کی۔ راجستھان، گجرات اور جنوبی ہند کے ایک دوسرے سے خاصے مختلف علاقوں اور ریاستوں جہاں زبانوں کی تبدیلی سے تہذیب میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، کے دورے کے بعد ڈاکٹر نوال ایک جگہ لکھتی ہیں کہ ''مصر وہند کے باشندے شکلاً کتنے ہی ایک دوسرے سے مشابہہ کیوں نہ ہوں زبان وبیان کا معاملہ ان میں یکسر مختلف ہے مصر میں صرف اور صرف عربی زبان ہی مادری اور سرکاری زبان ہے لیکن ہندوستان کی الگ الگ ریاستوں اور مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں ہیں جو سرکاری، مادری اور ثانوی زبانوں کے الگ الگ خانوں میں منقسم ہیں۔ البتہ عربی کی ہی طرح یہاں بھی زبانیں فصحیٰ اور عامی دونوں ہی لہجوں میں پروان چڑھتی ہیں۔ لہذا علوم لسانیات میں ہندوستان دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔'' آگے اپنی بات کی وضاحت کچھ اس طرح کرتی ہیں کہ ''ایک مصری بچہ ایک عرب ماحول میں پیدا ہوتا ہے اسی میں پروان چڑھتا ہے اور اخیر عمر تک اسی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے لیکن ایک ہندوستانی بچہ ہندی یا اردو، ملیالم یا تمل، پنجابی یا بنگالی یا اسی طرح کی کسی ایک مادری زبان بولنے والے گھرانہ میں آنکھ کھولتا ہے لیکن دوران پرورش اس کو ایک سے زیادہ زبانیں عموماً انگریزی یا ہندی بھی سکھائی جاتی ہیں ورنہ بیرون ریاست وہ کسی سے متعارف نہیں ہو سکے گا۔'' نیز لکھتی ہیں کہ انگریزی زبان کو ہندوستان میں مصر کے مقابلے کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہے۔ مصری قوم انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ دیتی ہے جبکہ ہندوستان میں اکثر علاقوں میں انگریزی کو سرکاری زبان تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس سفرنامے میں مناظر کا ایک ہجوم ہے اشیاء وحوادث کی تصویر کشی نئے نئے زاویوں سے کی گئی ہے۔ مثلاً سڑک پر پھدکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو دیکھ کر ڈاکٹر نوال کو ہندوستان کی فضا میں امن وسکون اور آزادی وخودمختاری کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے مصنفہ کی ذہنی جست کا بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح ایک عام منظر سے قاری کے ذہن کو بالکل نئی جہت میں موڑ دیتی ہیں۔ تاج محل جو عجائب عالم میں سے ایک ہے اور بذات خود غیر ملکی سیاحوں کی ہندوستان میں آمد کا ایک اہم سبب ہے ڈاکٹر نوال کو کچھ زیادہ نہ لبھا سکا اور ان کا تجزیہ کچھ یوں سامنے آیا ''تاج محل ایک مغل بادشاہ کی محبوب بیوی کے مقبرہ سے زیادہ کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ تو جو خطیر رقم اس کی تعمیر میں خرچ کی گئی وہ ملک کے کام آ سکتی تھی اور ہندوستان ایک زیادہ متمدن ملک ثابت ہو سکتا تھا۔''

جنوبی ہندوستان میں قیام کے دوران ڈاکٹر نوال نے چائے کے باغات کی سیر کرتے ہوئے چائے کی کاشت کے تمام کم وکیف معلوم کئے اور اپنے اس سفرنامہ میں محفوظ کر دیئے، لکھتی ہیں: ''چائے کا پودا دیگر

پودوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے اس کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ چند مخصوص شرائط کے ساتھ ہی اس کی کاشت ہوسکتی ہے جن میں ایک خاص قسم کی نشیبی زمین جو سمندری سطح سے چار ہزار فٹ اونچائی پر ہو، درجۂ حرارت، بارش، دھوپ چھاؤں اور ہوا میں نمی ان سب کا ایک متعین تناسب شامل ہے۔"

راجستھان کے محلات کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کرتی ہیں کہ" محلات کی در و دیوار حسین ترین نقوش و نگارشات سے مزین ہیں یہاں کے باغیچے اپنے نادر و نایاب پھولوں اور رنگ و بو سے زائرین کو مسحور کر دیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عالم وجود نہیں عالم خیال ہے۔"

ڈاکٹر نوال نے شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند کے سفر کے دوران نہ صرف مختلف ریاستوں، علاقوں اور اضلاع کی تہذیب و ثقافت کا مشاہدہ کیا بلکہ حتی الامکان وہاں کے ادباء و شعراء سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کے ادب کا سرسری ہی سہی کچھ مطالعہ بھی کیا۔ گرچہ اس بات کا براہ راست ان کے سفرنامے میں تذکرہ نہیں ہے لیکن درج ذیل چند جملوں سے اس امر واقع کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔"ہندوستانی ادبی شہ پاروں کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا ادبی سرمایہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث نہایت عمدہ اور ضخیم ہے اور عالمی ادبی منڈیوں کے متفق علیہ سربرآوردہ ادباء کی تخلیقات کی بنسبت زیادہ متنوع اور پر کیف و پر کشش بھی ہے۔"

اس دور کی مشہور ادیبہ و شاعرہ امریتا پریتم سے بھی ڈاکٹر نوال نے ملاقات کی۔ امریتا نے اپنے گھر دعوت کے دوران ان کو اپنی کہانیوں کا مجموعہ عطیہ کیا جس کا ڈاکٹر نوال نے دوران سفر ہی مطالعہ کیا اور ان کے مطابق اس ادبی شہ پارہ سے اہل ہند سے متعلق بہت سے دینی اور سماجی حقائق ان پر منکشف ہوئے۔

ہندوستان جیسے کثیر الادیان ملک سے قریب لانے میں ادیان اور معاشرتی علوم سے ڈاکٹر نوال کی دلچسپی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اپنے سفر کے دوران ڈاکٹر نوال نے ایک عام سیاح کی طرح صرف تاریخی آثار و شواہد دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یہاں کے مختلف ادیان کا مطالعہ بھی کیا بالخصوص ہندو دھرم کی بنیادی کتاب "گیتا" کو بنظر غائر پڑھا اور اس میں موجود علم نفس اور دور حاضر سے مطابقت رکھنے والی تعلیمات پر اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا۔ نیز ان مذاہب کی موجودہ عملی شکل کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر نوال نے ہندو، عیسائی، جینی، بودھ اور پارسی مذاہب کی متعدد عبادت گاہوں کی زیارت بھی کی۔

ایک جگہ لکھتی ہیں "میں نے ممبئی شہر میں ایک ہی دن میں پانچ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہندو مذہب کا مندر، جینی اور بودھ مذاہب کی عبادت گاہیں، عیسائیوں کا گرجا گھر (چرچ) اور مسجد شامل تھے۔ ان پانچوں مختلف الادیان عبادت گاہوں کو دیکھ کر میں تب حیران رہ گئی جب میں نے محسوس کیا کہ ان کی اندرونی و بیرونی تعمیر میں حد درجہ مشابہت ہے یکساں ستون اور گنبدیں اور وہی عبادت کے لئے مخصوص ایک مقام۔۔۔۔ یہی نہیں بلکہ مماثلت شاید اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اور وہ ہے اندرون معابد ان لوگوں کے لباس و حرکات میں گوناگوں مماثلت اور ان کے تعلق اور طرز برتاؤ میں مشابہت۔۔۔"

ان اقوال کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک سفرنامہ نویس کی حیثیت سے ڈاکٹر نوال ایک کامیاب قلم کار ہیں جنہوں نے نہ صرف ہندوستان کو دیکھا بلکہ اپنے قارئین کو دکھایا بھی۔ اس سفرنامہ کی ورق گردانی کے دوران مصنفہ محض ایک عام سیاح نہیں بلکہ حقائق کی تلاش کنندہ کے طور پر بھی ابھرتی ہیں لہذا ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں انہوں نے اشیاء و واقعات کے ظواہر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے پس پردہ وجوہات اور اسباب پر بھی توجہ کی ہے اور اپنی عقل سے اس کی تعلیل و توجیہہ کی بھی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ نیز اس سفرنامہ کے مطالعہ سے اس بات کا بھی بخوبی احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نوال کی اپنی شخصیت خواہ کتنی ہی پیچیدہ اور متنازع فیہ کیوں نہ ہو ہندوستان کی مختلف و متنازع دینی حیثیت کو باریکی سے سمجھنے کے لئے انہوں نے بڑی جد و جہد اور سعی کی ہے۔ گرچہ سفرنامہ کے ما بین السطور ایک اضطراب بھی نظر آتا ہے جو شاید مصنفہ کی شخصیت کی تاثیر ہے۔ لیکن بحیثیت ادبی شہ پارہ و سفرنامہ یہ مصنفہ کی ایک کامیاب اور مقبول و مفید کوشش ہے جو ان کو دیگر سیاحوں اور سفرنامہ نویسوں میں ممتاز بناتی ہے کیونکہ ہندوستان آنے والے کچھ فیصد سیاح ہی ہندوستان کو اتنے قریب سے دیکھ پاتے ہیں جتنے قریب سے ڈاکٹر نوال نے دیکھا، زائرین کی اکثریت محض سیر و تفریح کی جگہوں یا زیادہ سے زیادہ تاریخی مقامات کا رخ کرتی ہے۔

مجملہ ہندوستان سے متعلق ڈاکٹر نوال کا یہ سفرنامہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو محققین، طلبہ، اور سیاحین کے لئے بے حد اہم اور مفید معلومات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ انگریزی اور ڈچ زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

Dr. Zar Nigar
Deptt. of Arabic
University of Delhi
Delhi-110007

جویریہ قاضی

سانس کی طرح چلے منزلِ ہستی میں بشر

دورِ جدید میں انسان خلاؤں اور ہواؤں کو تو تسخیر کر رہا ہے لیکن ترقی کی اس دوڑ اور وقت کی قلت نے انسانی صحت کو برباد کیا ہے۔ شہروں کی مصروفیت میں بے شمار آدمی تو ہیں لیکن ہر شخص تنہا ہے یہاں تک کہ خود کو بھی میسر نہیں صحت عامہ کے حوالے سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دو بیماریوں میں یکساں شامل ہیں وہ ہے موٹاپا اور نفسیاتی امراض۔ آج کل جہاں مختلف امراض کا دور دورہ ہے وہاں موٹاپا عالمی مرض بن چکا ہے۔ دنیا بھر میں تقریباً ہر تیسرا شخص موٹاپے کا شکار ہے اور ہر قسم کے اشتہارات لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ موٹاپا موروثی بھی ہوتا ہے یا پھر وہ لوگ جو بسیار خور اور کسلمند ہوتے ہیں وہ اس کا شکار ہوتے ہیں زیادہ وقت دفتر یا گھر میں بیٹھ کر گزارتے ہیں اور ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس میں جسمانی مشقت شامل ہو تو وہ توانائی کی چربی بن کر جسم میں اکٹھا ہونے لگتی ہے۔ موٹاپا کے شکار لوگ دل کے امراض، فشارِ خون، گردوں میں پتھری، ذیابطیس، جوڑوں میں درد، سانس لینے میں دشواری، ہڈیوں کی کمزوری جیسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جدید مشینی اور آرام پسند دور نے جہاں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں موٹاپے جیسے مرض کا سامنا بھی ہے۔ موٹاپے سے نجات پانے کے لیے بے حد صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکثر لوگ کھانا پینا کم کر دیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ چند دنوں میں وہ دبلے پتلے دکھائی دیں گے۔ صرف کھانے پینے کی کمی سے موٹاپا دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ چہل قدمی اور ورزش بھی ضروری ہے ڈپریشن بھی موٹاپے کا ایک سبب ہوتا ہے اس لیے یوگا ایک ایسی ورزش ہے جو جسم کے ساتھ دماغ کے لیے بھی سود مند ہے۔ یوگا کا شمار قدیم ورزشوں میں ہوتا ہے جو جسمانی نظم وضبط کو قائم رکھتی ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ ورزش تقریباً 5ہزار سال پرانی ہے لفظ یوگا سنسکرت زبان سے نکلا ہے جس کے معنی مدغم ہونا ہے جس میں اس بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ آپ اپنے جسم اور سانس کی حرکات کے ذریعے اپنے دماغ کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ آج کل یوگا شہرت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ پوری دنیا میں لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہیں کچھ لوگوں نے یوگا کو مذہب کے معنوں میں لینا شروع کر دیا ہے جو کہ بالکل درست نہیں ہے یوگا کسی بھی مذہب کی روایتی تعریف پر پورا نہیں اترتا بلکہ صرف جسمانی اور نفسیاتی نظم ونسق کا نام ہے جس کی بار بار مشق کی جاتی ہے۔ آج کل زندگی اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے کہ انسان کو ذہنی معاشی اور معاشرتی مسائل کا مسلسل سامنا کرنا پڑتا ہے ذہنی تناؤ کو دور کرنے کے لیے یوگا بہت کارآمد ہے اس کے ذریعے ذہنی صلاحیتوں کو ابھر کر سامنے آنے کا موقع ملتا ہے۔ یوگا جسمانی تھکاوٹ دور کرتا ہے اور جسم میں چستی پیدا کرتا ہے۔

☆یوگا کے فائدے

1۔ یوگا کرنے سے ذہن کی تطہیر ہوتی ہے۔

2۔ یوگا کرنے سے جسم میں لچک اور چستی پیدا ہوتی ہے۔

3۔ یوگا پٹھوں کو مضبوط کر کے ذہن کو سکون بخشتا ہے۔

4۔ یہ چہرے اور جسامت کو خوبصورت رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان کو بڑھاپے سے دور رکھتا ہے۔

5۔ دورانِ خون کو بہتر کر کے آکسیجن کے عمل کو تیز کرتا ہے۔

6۔ نظامِ انہضام کو ٹھیک رکھتا ہے۔

خواتین کو دیکھیں تو کاموں کی ایک لمبی قطار ہے اس طرح دن مہینے اور سال گزر جاتے ہیں خواتین کی یہ خود کلامی یا سرگوشیاں ہر گھر میں سنائی دیتی ہیں کہ آرام بھی کرنا ہے مگر تھوڑے اور کاموں سے فارغ ہو کر۔۔۔۔ سارے بکھیڑے سمٹ جائیں گے تو پھر کچھ دیر صرف اپنے

ساتھ بیٹھوں گی۔۔۔ چائے پیوں گی۔۔۔ یا پھر چہل قدمی کرلوں گی تا کہ ذہن کو بھی تازگی میسر آجائے۔زیادہ تر خواتین یہ باتیں سوچا ہی کرتی ہیں مگر سچ بتایئے کیا آپ کے بھی کم وبیش یہی معمولات ہیں؟ کیا آپ بھی چند گنی چنی خواتین کی طرح دماغی تھکن کے اس واضح اشارے کو سمجھ پاتی ہیں کہ اب کام کی زیادتی کی وجہ سے آپ بری طرح سے تھکنے والی ہیں؟ یا آپ ذہن جھٹک کر خود کو مطمئن کرنے کے جتن کرنے لگتی ہیں کہ بھئی یہ تھکن کیا ہوتی ہے؟ لیکن سائنس اور طب آپ کی اس دلیل کو رد کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں جب آپ پر تھکان کا حملہ ہوتا ہے تو آپ کا عصبی نظام دل، جگر، قوتِ مدافعت سب ہی متاثر ہوتے ہیں۔ہماری زندگی میں افراتفری اور مایوسیوں نے جگہ بنالی ہے۔خواتین، بچے، بوڑھے اور جوان جذباتی خلفشار کا شکار نظر آتے ہیں لیکن جبر کے اس ماحول سے نجات بھی ممکن نہیں ہمیں اسی زندگی سے کچھ لمحے نکال کر اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے بہتر حالات پیدا کرنے ہیں ہر پیچیدہ صورتِ حال کو برداشت کرنا ہے مگر ان صبر آزما حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تندرست و توانا جسم درکار ہے۔

یوگا ایک ایسی ورزش ہے جو کم سے کم وقت میں بغیر کسی مشین کے ہر عمر اور ہر قسم کے افراد کر سکتے ہیں۔یقین جانیے آپ ہفتے دس دن میں نمایاں تبدیلیاں محسوس کریں گی۔اگر آپ سکون بخش ادویات کی عادی ہیں تو اس کے لیے بھی یوگا بہت کارآمد ہے۔یہ فن بہت پراسرار رہا ہے۔نسل در نسل راہبوں، جوگیوں اور صحرانوردوں میں منتقل ہوتا رہا ہے۔یوگا انسان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ جسم کا رشتہ روح سے استوار رکھنے کے لیے آکسیجن سے بڑی کوئی نعمت نہیں اس لیے ماہرین یوگا نے سانس کی مختلف مشقیں ایجاد کی ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ آکسیجن خون میں شامل ہوسکے۔

وہ جس کے ذہن وجسم وجاں سرِ محفل ہیں آلودہ
حقیقت میں مویشی ہے بظاہر ایک انساں ہے

ہم زمین پر اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں احسنِ تقویم کا درجہ عطا کیا ہے تو اس بات کی مکمل ترجمانی ہوجاتی ہے کہ ہمارے عقائد کی جڑیں راہِ راست حسنِ معاشرت سے جڑی ہیں لیکن ہمارے اعمال میں ان افکار کی عکاسی نہیں ہو رہی ہے آپؐ نے فرمایا ''صحت اور فراغت نعمت ہیں اور سورۂ رحمٰن کی تکرار کرنے والی آیت کو جو تین معنوں میں سمجھا جاسکتا ہے کسی بھی نعمت کا جھٹلانا، دینے والے کی ناقدری کرنا، کم تر مصرف پر استعمال کرنا، اس لیے ضروری ہے صحت جیسی نعمت کے لیے ذہن وقلب کی آلائشوں سے چھٹکارا پایا جائے۔

غیر فطری نظامِ زندگی، سونے، جاگنے اور کھانے پینے میں بے اعتدالی کے علاوہ فاسٹ فوڈ سے زندہ انسان بظاہر صحتمند نظر آتے ہوئے بھی کاہل اور سست بن چکا ہے۔حتیٰ کہ وہ کسی بھی کام کے لائق نہیں بچا ان سب کا واحد علاج فطرت کی جانب لوٹنا اور اپنی طرزِ معاشرت میں حفظانِ صحت کے اصولوں کی زندگی کے سبھی لمحات میں پابندیاں کرنا یہی چند تبدیلیاں ہمیں زندگی کی طرف لوٹنے میں مدد کرسکیں گی اور اسی سلسلے کی ایک کڑی یوگا ہے یہ مقابلے والا کھیل نہیں ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا دوست مشین پر کھڑا ہو کر خوب دوڑتا ہے یا آپ سے زیادہ وزن اٹھالیتا ہے یوگا اپنے جسم کی قوت برداشت کے مطابق کیا جاتا ہے لہٰذا اس سے آپ کو چوٹ نہیں پڑتی کوئی بھی آرام دہ لباس پہن لیجیے کسی خاص چٹائی کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہی جگہ کی قید ہے۔صاف ستھری اور ہوادار جگہ پر یوگا کیا جاسکتا ہے۔یوگا سے آپ کے جسم کے اتنے حرارے نہیں جلتے، جتنے وزن اٹھانے والی ورزشوں سے جلتے ہیں۔چنانچہ یوگا کرنے والوں کو زیادہ غذا نہیں کھانی پڑتی۔وزن اٹھانے والی ورزشوں سے جسم میں فاسد مادے پیدا ہوجاتے ہیں جو یوگا کرنے سے ختم ہوجاتے ہیں۔

یوگا سے آپ کے جذبات میں توازن رہتا ہے چنانچہ آپ کے سماجی تعلقات میں بہتری پیدا ہوجاتی ہے اور آپ خوش وخرم رہتے ہیں۔یوگا سے آپ کے طرزِ زندگی میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔اس سے وزن کم ہوجاتا ہے دماغی فرحت وانبساط حاصل ہوتا ہے۔کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔غور کریں تو صحت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا تحفہ ہے۔بلکہ قدرت نے جتنی وسیع منصوبہ بندی انسان کو صحت مند رکھنے کے لیے کی ہے اتنی شاید پوری کائنات بنانے کے لیے بھی نہیں کی۔اسلام دینِ فطرت ہے جو پوری انسانیت کی ہر شعبے میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔اسلام کی پاکیزہ تعلیمات جہاں عقائد وعبادات، معاشرت ومعاملات اور اخلاق وآداب کے تمام پہلوؤں کے لیے جامع ہیں، وہیں حفظانِ صحت اور تندرستی کے معاملے میں بھی اسلام کی معتدل ہدایات موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم نہ صرف صحت مند زندگی گزار سکتے ہیں بلکہ بہت سی مہلک بیماریوں سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔

Jaweria Kazi
Head Mistress
Momin Girls High School
Rais High School Campus
Bhiwandi. Distt. Thane- 421302 (M.S)

اردو شاعری کی اہم سمتیں

(مختصر جائزہ)

تسنیم بانو

دنیا کا ہر ادب نثر و نظم کا مرکب ہوتا ہے۔ اور یہی نہج اردو ادب کی بھی ہے۔ یعنی اردو ادب بھی شعری و نثری، دو طرح کے فن پاروں پر مشتمل ہے۔ جس میں نثری ادب کسی فن پارے کی فہم وفراست، اس کی تفصیل و وضاحت اور کسی مشکل سے مشکل امر کے تعمق کا وسیلہ ہوتا ہے۔ تاہم اس فن پارے کا میدانِ عمل اتنا وسیع ہوتا ہے کہ مشکل ترین امر پر بحث ومباحثے اور غور وخوض کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ہوتا ہے۔ جبکہ شعری ادب پوری طرح قواعد کی گرفت سے مربوط ومزین اور اعلیٰ ترین تخلیقی اظہار ہے۔ اس فن پارے کے ایک ایک لفظ کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ جسے ایک مقام سے اٹھا کر دوسرے مقام پر لے جانے کی چنداں گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ قواعد کا پابند ہونے کے ساتھ ہی یہ فن پارہ فنی نقطۂ نظر سے حسن وجمال کا پیکر اور زودِ اثر ہوتا ہے۔ یہاں تصوّر و تخیل کی گہرائی کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی دلکشی، معنی آفرینی اور دل آویزی نہایت مقبول اور زودِ اثر ہوتی ہے۔ اسی سبب ہماری تہذیب اور ادب میں شاعری کو وہ اعلیٰ مقام حاصل ہے جو کسی فنونِ لطیفہ کے شعبے کو حاصل نہیں۔

"فنِ تعمیر کے خوبصورت سے خوبصورت نمونہ کو بھی شعر و ادب کے حسن و جمال پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ مصوری کے شاہکار نمونے بھی شاعری کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ مصوری جہاں خاموش شاعری سے تعبیر کی جاتی ہے وہیں شاعری کو بولتی ہوئی مصوری کا درجہ حاصل ہے۔ مجسمہ سازی کی انفرادی کشش سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن وہ کشش شعری زیبائش و آرائش کے آگے ماند پڑنے لگتی ہے۔ سُر تال کے اشتراک سے موسیقی کی سحر انگیزیاں بھلے ہی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی ہوں، لیکن الفاظ کا جادو اس کا مخصوص آہنگ ترنم اور بہاؤ محسوسات پر اپنا غلبہ قائم کر لیتا ہے اور اور ہم برسوں اس کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتے۔"

اسے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نثری ادب فہم وفراست کا جزّ معلوم ہوتا ہے، تو شعری ادب لب ولہجہ کے اعتبار سے حسن وعشق کا پیرو مزاج پرست ہوتا ہے اور ساتھ ہی زودِ اثر بھی۔ جیسا کہ ضیاء الحق کا قول ہے۔

"شاعری کا انسانی زندگی میں اعلیٰ مقام اس کی تاثیر کا مرہون منت ہے۔ جو انسانی باطن کی کایا کلپ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ تاثیر ہی ہے جس کی وجہ سے انسانیت کو اکثر مشکل مقامات پر شاعری کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔"

لیکن کوئی عمل ہمیشہ یکساں طور پر کسی ادب میں ملنا ممکن نہیں، کیونکہ ادب سماج اور زندگی کا پرتو ہوتا ہے اور اسی ماحول میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ فطری لحاظ سے ادب وشاعر کا فکر وخیال نفسیاتی ومعاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے معاشرتی، سیاسی وتہذیبی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، فنکار کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہیں۔ جس کے سبب ادب کی سمتیں تغیّر وتبدل کے طابع ہوتی جاتی ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو ادب کا شعری پہلو اب تک کن اہم سمتوں کی طرف متغیر رہا اور آج اس کی کیا سمت ہے۔ اور پھر آئندہ زمانے کے تعلق سے کیا ممکنات پوشیدہ ہیں۔

تاہم اردو کے شعری ادب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس فن پارے کا سلسلہ بہمنی دور سے شروع ہوتا ہے جو ایک لحاظ سے تصوّف کا دور رہا۔ اسی عہد میں صوفی شعراء یا تو پند و وعظ و نصیحت میں مصروف رہے یا تبلیغ کے ساتھ ساتھ الوہیت کے گیت گائے اور اسی حالت میں اپنی ذات کو فراموش کئے رہے۔ جس کے سبب شاعری عشق حقیقی کا پرتو رہا اور ممکن ہے یہی جذبۂ عشق شعوری طور پر زبان کو عوامی، سادہ سلیس، بنانے کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کا بتدریج احاطہ بھی کرتا رہا ہو۔ اس مکتبۂ فکر میں بندہ نواز گیسو دراز، نظامی، شمش العشاق، میراں جی اور بہران الدین جانم وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اکثر محققین کے مطابق ہندوستانی میں اردو شاعری کا پہلا مرکز حسن آباد گلبرگہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں فارسی اور اردو کے مصنف اور صوفی منش شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز تسلیم کیے جاتے ہیں جو 1412 میں دہلی سے گل برگہ (حسن آباد) دکن تشریف لائے۔ اور یہیں عشق حقیقی کے گیت گاتے اور اپنے مریدوں کو عشق الٰہی کا درس دیتے رہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا خاندانی شجرہ امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام شہید کربلا سے اٹھارویں پشت میں ملتا ہے۔ اس طرح آپ حسینی سادات ہیں۔ آپ نے غزلیہ شاعری سے اپنے مریدوں کو عشق حقیقی کا درس دیا۔ ان کی شاعری کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نور نبی رسول کا میرے من بھایا

(گیسو دراز)

دکن میں اردو ادب کو بہمنی شاہوں نے خوب نوازا اور فروغ دیا کیونکہ وہ سب بڑے ادب نواز تھے۔ بہمنی دور کا آٹھواں بادشاہ فیروز شاہ بہمنی تو خود بھی اچھا شاعر تھا اور بیدری تخلص کرتا تھا ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے ناؤ ہے قطب دین قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

(فیروز شاہ بیدری)

فیروز کی غزلیہ شاعری میں نشاطیہ عناصر زیادہ ملتے ہیں جن سے محبوبہ کی صورت سامنے آتی ہے۔ اس طرح اس شاعر نے نشاطیہ غزلوں کو اپنے عہد میں فروغ دیا۔ دکن کا مشہور شاعر ملا وجہی فیروز شاہ کو اپنی مثنوی قطب مشتری میں یوں یاد فرماتا ہے۔

کہ فیروز آ خواب میں رات کو
دعا دے کے چوما میرے ہاتھ کو

کہ فیروز محمود اچتے جو آج
تو اس شعر کو بہت ہوتا رواج"

(ملّا وجہی)

اسی طرح دکن کا مشہور شاعر نشاطی بھی "پھول بن" میں فیروز شاہ کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچھ میرے داد

(نشاطی)

حتّٰی کہ دکن کے عظیم مشہور شعراء نے بہمنی دور کے شاعری پسند شاہوں نے اردو شاعری کو خوب خوب سراہا ہے۔ جن میں فیروز شاہ بہمنی صف اول کے شاعر ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ بہمنی دور اردو ادب کی پہلی اینٹ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اور غالباً اسی لئے شاعر مشرق یوں پکار اٹھے ہیں۔

اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

البتہ شاہان بہمنی بذات خود شاعر تھے اور شاعر نواز بھی تھے اور صوفی شعراء کے شاگرد، مرید اور عقیدت مند بھی تھے۔ چونکہ اسرار رموز کی تفہیم کیلئے مرشد کامل سے عقیدت لازمی ہے، اس لئے انہوں نے صوفی شعراء سے عقیدت و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا اور ساتھ ہی علم و ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں فیروز شاہ بذات خود شاعر اور علم نواز تھے۔ زبانیں سیکھنے کا شوق انھیں اس قدر تھا کہ انھوں نے کئی زبانوں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان سے ان کی زبانوں میں شاعری کرنا بھی سیکھا۔ ان زبانوں میں اردو زبان اہم ہے۔ اکثر محققین فیروز شاہ کو اردو مثنوی کا موجد اور غزل کا مشاق شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان محققین میں مشہور اور معروف سیدہ جعفر اور گیان چند جین کی مثال پیش خدمت ہے۔

"فیروز کی غزلوں میں ہندی اور فارسی رجحات کا نیا امتزاج نظر آتا ہے۔ جس میں گیتوں کا رس اور مٹھاس بھی ہے۔ اور غزل کی روایات کی جھلک بھی۔"

بہمنی حکومت کے زوال پزیر ہوتے ہی دکن میں عادل شاہی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عہد میں دکنی ادب کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے بہت سے شعراء نے شمال کی راہ اختیار کی، جو رہے ان پر ہندی کا اثر غالب رہا اور اس ملی جلی زبان میں رموز عشق الٰہی کا ذکر چلتا رہا۔

نور وہی ہے جسے مطلق
شاہد ہے جمال بوجھے نور ہے کا ہی حال

(رموز السالکین)

اس عہد کے مشہور شاعر مقیمی عشق کی تعریف اور حسن کا کیف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پربت بن عشق کیں اپجتا نہیں کہ مرنا جینا سمجھتا نہیں
پربت کی ندی نت ابلتی رہے پربت سونچ دنیا پہ چلتی رہے

(مقیمی چندر بدن مہیار)

مقیمی فارسی اور ہندی زبان کی ملاوٹ کے ساتھ ساتھ مثنوی کے ذریعہ تصوف کے رموز سے واقف کراتے رہے۔دکنی شاعری کے اس دور میں محاسن شاعری کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔اس طرح دکن کے عادل شاہی دور کے بعد قطب شاہی دور آتا ہے یہ شیعہ حکمرانوں کا دور تھا اور اس عہد میں اردو شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔اس دور کی اردو شاعری میں مثنوی کو سب سے زیادہ عروج ملا۔اس لئے اسے مثنویوں کے عہد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔اس دور کی تمام مثنویوں میں ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' دکن کی گراں مایہ تخلیق ہے۔

اس مثنوی کا تعلق چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہونے والے گولکنڈہ کے سلطان دوئم اور اس کی محبوبہ بھاگمتی سے ہے۔جو موضع چچلم کی ایک رقاصہ تھی۔چودہ سالہ سلطان اور اس کی محبوبہ بھاگمتی کے عشق کی داستان کے پردے میں شاعر نے عشق کے رموز و معارف سے متعارف کرایا ہے۔اپنی معشوقہ کے نام پر بادشاہ نے ''بھاگ نگر'' بسایا جو بعد میں حیدرآباد کہلایا اور آج بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔چونکہ شہزادہ کی ماں کا نام بھی بھاگمتی تھا اس لئے شاعر نے معشوقہ کا نام مشتری رکھا اور شہر ''بھاگ نگر'' کا نام بدل کر حیدرآباد کردیا۔کیونکہ بادشاہ کے نزدیک ملکہ کا نام حیدر محل زیادہ پسند تھا۔وجہی تشبیہات کی دنیا کا وہ عظیم شاعر ہے جس کی مثال دنیائے شاعری میں ملنا دشوار ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

'انچل اس مصلیٰ ہے جبرائیل کا
سیہ تل تو سبحہ سرافیل کا
انکھیاں پر بھواں چھند سوں چھائے ہیں
کہ نزکاں سرال پہ طرّے لائے ہیں

(وجہی)

وجہی کی شاعری کے حدود کے اندر جبرائیل کا مصلیٰ اور اسرافیل کی تسبیح کے دانے بھی ہیں اور پلکوں کے اوپر بھنویں فوج کے سر پر طرۃ بھی معلوم ہوتی ہیں۔اس طرح شعرائے دکن کی مثنویاں شاعرانہ عظمتوں کے زندہ و پائندہ نشان ہیں۔

گوکہ اورنگ زیب کے دکن کا رخ کرنے اور ریاستوں کے اختتام کے سبب شعرائے دکن نے دہلی کا رخ کیا تو اردو شاعری میں تصوف کے ساتھ ساتھ داخلیت نے جگہ لے لی۔جس سے شعری ذخائر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی اور ساتھ ہی انداز بیان پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔جس کے سبب زبان صاف، سلیس اور عوام و خواص پسند ہوتی گئی۔زبان و بیان کی ان شعری کاوشوں کے سلسلے میں ولی، حاتم، آبرو، جانم، جان جاناں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔دکن اور گردو نواح کے ان دہلوی شعراء میں ہندی کے اثر سے صنعت ایہام گوئی کا چلن عام ہوگیا۔مثال کے طور پر آبرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غزالاں ،آبرو کر چاک دل مدت سے نکلا ہے
کہو کیا حال ہے دشت جنوں میں اس دیوانے کا

(آبرو)

مضموں ایک ایسے شاعر بھی اس دور میں گذرے ہیں جنہیں صنعت ایہام گوئی پر فخر تھا۔

ہوا ہے جگ میں مضموں تیرا شہرہ
طرح ایہام کی جب سے نکالی

تاہم ایہام گوئی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے شعراء کی زبان صاف اور سہل و رواں پائی جاتی ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ تیرے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

(مضموں)

بعد کے دہلوی شعراء نے اردو شاعری کو ایہام گوئی کی روشنی سے پاک کیا اور شاعری میں فصاحت و بلاغت ،معنی آفرینی،زبان کی صفائی، روانی پر خاصہ زور دیا جانے لگا۔اس دور میں اردو شاعری کا معیار اس قدر بلند ہوا کہ یہ عہد اردو شاعری کا عہد زریں کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔اس عہد نے اردو شاعری کو وہ مقام عطا کیا جس پر اردو شاعری کو ناز ہے۔اس عہد کی شاعرانہ عظمت،شوکت کی بدولت اردو شاعری دیگر زبانوں میں اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔بلکہ جو لطافت اور شیرینی اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی اور زبان کی شاعری کو میسر نہیں۔
عہد زریں یعنی میر و سودا کے عہد میں غزلیہ شاعری، قصیدہ گوئی

اپنے بام عروج پر تھی۔ جس میں سودا کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ غزلیہ شاعری میں سودا کے علاوہ میر، غالب اور مومن نے نازک خیالی، تصوف اور تخیلات کی ایسی دنیا آباد کی جس کی مثال دنیائے شاعری میں بمشکل ملتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی تک روتے روتے سوگیا ہے
(میر تقی میر)

موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے دل خاک ہوگیا ہے کسی بے قرار کا
(سودا)

لوگ کہتے ہیں یاد آتا ہے دل تجھے اعتبار آتا ہے
(میر اثر)
(سودا)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

سلطنت مغلیہ کی بربادی اور مفلوک الحالی کے سبب دہلی سلطنت برائے نام رہ گئی۔ اس زمانہ میں شعرائے دکن وشعرائے دہلی نے لکھنو کا رخ کیا اور لکھنو شعروشاعری کا مرکز بنا۔ (1797) اس زمانہ میں میر، سودا اور دیگر شعراء نے لکھنو کا رخ کیا۔ لیکن غالب ومومن وغیرہ نے اپنا مسکن نہ چھوڑا۔ چونکہ لکھنو میں فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ اس لئے دبستان لکھنو کے شعراء میں خارجیت کا عنصر عیاں تھا۔ جبکہ دتی سے آئے ہوئے شعراء کی شاعری داخلی جذبات سے پُر تھی اس لئے دتی کے شعراء یہاں بہت کم حوصلہ افزاء اور داد و تحسین کے حقدار ہوئے اور لکھنو کے شعراء میں عورتوں کے ناز وادا اور غمزہ پر توجہ مرکوز ہونے سے شاعرانہ عظمت داغدار ہوتی رہی۔ یہ لکھنو اسکول کی بڑی خامی تسلیم کی جاتی ہے۔

آشفتہ زلف چاک قبا نیم باز چشم
ہیں صحبت شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز
(شیفتہ)

لکھنؤ ادب میں دو مثنویاں اردو کی گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ایک ''گلزار نسیم'' اور دوسری ''سحر البیان''۔ ''گلزار نسیم'' میں جہاں بندش الفاظ کی چمک دمک ہے وہیں سحر البیان میں جذبات وتخیلات ومنظرکشی کی فنکاری ہے۔ گلزار نسیم میں اختصار ہے تو سحر البیان میں کھلا اظہار ہے۔ بہر حال دونوں مثنویوں کو کمال حاصل ہے۔ لکھنؤ شاعری کا سب سے عمدہ پہلو اس کی مرثیہ نگاری ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری کے جو جوہر دکھائے ہیں اور فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے ہیں اور شوکت الفاظ سے کلام کو جس طرح مزین کیا ہے اور جو فنی کمالات دکھائے ہیں اس پر اردو شاعری کو ناز ہے کہ دیگر زبان میں یہ شاعرانہ شوکت وجذبات نگاری کی یہ مصورانہ اور والہانہ انداز بیاں عنقا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا
(انیس)

پیاسی جو تھیں سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی
(انیس)

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبرئیل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو
(مرزا دبیر)

گو کہ انقلاب 1857 نے اردو شاعری میں نیا انقلاب پیدا کیا۔ جس کے اثر کے سبب شاعری سے گل وبلبل کے نغمے جاتے رہے۔ چنگ ورباب کی گونج سے اہل دل کی محفل سونی ہوگئی۔ خاموشی اور مایوسی کے بادل چھاگئے۔ ایسی مایوس کن ساعت میں شعرائے اردو نے آہ وواہ کی شاعری سے اجتناب کیا اور اجتہاد سے کام لینا شروع کیا۔ شبلی وحالی نے ڈھارس بندھایا، اسلامی زہد کی دعوت دی، تو اکثر نے ظریفانہ رویہ اختیار کر قوم کو بیدار کرنے کی کوششیں کی۔ اس ضمن کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بس اب علم وفن کے وہ پھیلا وَساماں
کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہ ترقی ہوں آساں
امیروں میں نور تعلم ہو تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتئ دین ملت کو تھامے
(حالی)

اسی قومی احساسات کو اکبر الہ آبادی نے ظرافت کے موثر اور معیاری انداز بیان میں ڈھال کر قوم کو بیدار کیا ہے۔

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس
(اکبرالہ آبادی)

ہر چند کی اکبرالہ آبادی کے طنز و مزاح میں محض قوم وملت کادرد سربول رہاتھا۔وہ اس فکر میں تھے کہ قوم کی پستی کا دردسر میرے بعد کس کے سرجائے اسطرح کہتے ہیں۔

امانت عشق میرے بعد نہ جانے ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر پر دردِ سر اپنا
(اکبرالہ آبادی)

اکبر کا یہ دردِسر اٹھانے والا کون ہوگا یہ انھیں معلوم نہ تھا مدت سے انھیں اسی شخص کی تلاش تھی جسے اقبالؔ نے اٹھالیا۔دیکھئے اکبرالہ آبادی خود لکھتے ہیں۔

''مدت کا پرانا شعر ہے۔دیکھا کہ وہ بارِغم جو میرے دل پر مستولی تھا آپ کے (سر) نے اٹھالیا وہی درد تھا وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن ترشوائی،یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں۔''

اقبالؔ کا دل مشرق کی بدحالی سے بھرچکا تھا اور وہ اپنے آنسوؤں سے شبنم کے قطروں کی طرح قوم کو وضو کرانا چاہتے ہیں اور اپنے نالہ وفریاد سے قوم کی فلاح کے لئے دعا کے آرزو مند بھی ہیں۔

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مراوضوع ہو نالہ میری دعا ہو
ہر درد مند دل کو رونا مرا رلادے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے
(اقبالؔ)

اس وقت مسلم ممالک مغربی استعمار اور اس کی عیاریوں کا شکار ہوتے جارہے تھے۔اور مغربی استعمار کی گرفت ان پر مضبوط ہوتی جارہی تھی۔اس لئے اقبالؔ اپنے فکرونظر کو آفاقیت کی رہگزر پر ڈال دیتے ہیں۔اور آگے لے جاکر اس کا رُخ اسلامیت کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا
(اقبالؔ)

اقبالؔ ہی اُردو کا ایسا آفاقی شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں نئے نئے تجربے کئے۔اور ان کی شاعری اپنے عہد کے مسائل کا حل تلاش کرنے تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعور عالم اور اس کے مسائل پر ان کی نظر اپنے ڈورے ڈال رہی تھی۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
(اقبالؔ)

چنانچہ اقبالؔ کی شاعری شعور عالم وفن دونوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔اقبالؔ کے آخری دور یعنی 1936 میں ایک نئی ادبی تحریک وجود میں آئی جس میں پسماندہ اقوام کی آواز بلند کرنے اور استحصال سے نجات دلانے کی سعی نظر آرہی تھی۔اس لئے شعرائے اردو اور ہندی نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا۔اور شعرائے اردو میں اس تحریک سے وابستہ ہونے والے شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی،جذبیؔ،مجازؔ،وامقؔ اور علی سردار جعفری وفیضؔ کے نام سرفہرست ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ غریب کسان،مزدور کا درد بانٹنے کی پوری کوششیں کیں۔جوشؔ ملیح آبادی نے اردو شاعری میں انقلاب کوہوادی اور شاعرِ انقلاب کہلائے۔

اللہ اللہ میرے دہشت ناک خونی ولولے
آندھیاں طوفاں، طلاطم، سیل، صرصر، زلزلے
ابتری، وحشت، تزلزل، طنطنہ دہشت، فساد
دبدبے، گرمی، کشاکش، دغدغے، ہلچل، جہاد
(جوشؔ ملیح آبادی)

یہ وہ عہد تھا جب استحصالی قوتوں اور انگریزی استعمار کے خلاف ''انگارے'' کی چنگاریاں ہندوستان میں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔جن سے شعراؔ کا حساس دل متاثر ہوئے بغیر کہاں رہ سکتا تھا۔نتیجتاً مجاز جیسا شاعرِ مُطرب بھی نقیب انقلاب بن بیٹھا اور پکار کر کہنے لگا:-

چھوڑ دے مطرب اب لِلّٰہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
(مجازؔ لکھنوی)

اور وہ صنف نازک کے خوبصورت آنچل کو بھی انقلابی پرچم دیکھنا پسند کرتا ہے۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
(مجازؔ لکھنوی)

اس انقلابی فضاء کو انگریزی استعمار جتنا دبانے کی کوشش کر رہا تھا اس سے شعراء اتنا ہی زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔ جیسا کہ وامق کا اشفاق اللہ خاں کی پھانسی کے حوالے سے یہ قول ثابت کرتا ہے۔

''حکومت برطانیہ کے مظالم میں یہ ایک ایسا ظلم تھا جس نے مجھ جیسے بے فکرے کو اشفاق اللہ خاں زندہ باد، مہاتما گاندھی زندہ باد، انگریز حکومت مردآباد کے نعرے لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔''

یعنی وامق جیسا لاأبالی شاعر بھی انقلابی بن کر سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف لڑنے والوں کی صفوں میں رجز خوانی کرتا نظر آنے لگتا ہے۔

کوئی قوت اس کی سدِ راہ بن سکتی نہیں
وقت کا فرمان جب آتا ہے بن کر انقلاب
اہل دانش کا رجز اور سینۂ دہقاں کی ڈھال
لشکر مزدور کے ہیں ہم صغیر وہم رکاب

(وامق)

البتہ عہد حاضر کے شعراء کا نظریہ انقلابی نہیں رہا بلکہ یکسر بدل گیا۔ اور یہ طلب زر کی خاطر فلمی نغمے لکھنے لگے یا پھر سیاسی عینک لگا کر سیاسی جماعت کی قصائد خوانی میں مصروف ہو گئے اور ان کے اندر کا شاعر سونے لگا اور اب وہ بندشوں کی قید سے محض مجبور ہیں۔

نہ یہ زندگی مری زندگی نہ یہ داستاں مری داستاں
میں خیال و وہم سے دور ہوں مجھے آج کوئی صدا نہ دے

(شکیل بدایونی)

تاہم اس عہد شاعری میں غزل کا دامن مراد پوری طرح پُر نظر آتا ہے جس میں حسن وعشق کی کیفیات وسوز گداز، جذبات کی رَو اور جمالیاتی قدریں سب ہی کچھ موجود ہیں۔ ہر چند کہ اردو غزل اپنے رنگ تغزل میں اس عہد میں سب سے زیادہ نکھری وتھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ضمن کی تصدیق کے لئے شاعر شکیل بدایونی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اردو کو جس انداز بیاں کی ہے ضرورت
ملتا ہے وہ انداز بیاں میری غزل میں
محدود نہیں دائرۂ رنگ تغزل
ہر شعبہ ہستی ہے نہاں میری غزل میں

(شکیل بدایونی)

اس طرح ہم عہد حاضر کے تمام شعرائے اردو میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ شاعر شکیل بدایونی کو پاتے ہیں۔ جنھیں عہد حاضر کے شاعر شباب کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

ہم شاعر شباب رہیں گے سدا شکیلؔ
ڈھلتی ہے عمر اپنی تو ڈھلنے بھی دیجئے

(شکیل بدایونی)

ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں تو اس عہد کی غزلیہ شاعری کا محور محبوب کا وہ دمکتا ہوا مقدس چہرہ ہے جسے وہ صحیفے کی طرح جزدان میں چھپا رکھا ہے اور جب قرآن کی طرح ہاتھوں کی رحل میں لیکر پڑھتا ہے تو پھر اسے دوسرے صحیفے کے پڑھنے کی خواہش نہیں رہ جاتی۔ عشق حقیقی کے رموز کا ایسا بے باک خاکہ کسی عہد کی شاعری میں نہیں ملتا۔

میری آنکھوں میں دمکتا ہوا چہرہ اس کا
کب سے جزدان میں رکھا ہے صحیفہ اس کا
جب رحل میں ہاتھوں کے ہو قرآن سا چہرہ
کچھ اس کے سوا پڑھنے کی خواہش نہیں ہوتی

(نعمان شوق)

الغرض اردو شاعری بندہ نواز گیسو دراز کی غزلیہ شاعری سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہوئے، کروٹیں لیتی ہوئی اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔ اور اس نے اپنے اس سات سو سالہ سفر کا آغاز غزلیہ شاعری سے نادر اور میٹھے انداز میں کرتے ہوئے کبھی مثنوی، کے صبار فتار گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ دوڑتی رہی تو کبھی قطعات ورباعیات کی سواری پر خوش غنائی کرتی ہوئی تو کبھی مراثی کی نوحہ کناں سواری پر سوار ہو کر سوز وغم سے محفل کو گریاں ونالہ کرتی رہی اور آنکھوں سے اشک ٹپکاتی رہی تو کبھی سوئی قوم کو نظم جدید کی ہوش ربا نغمات سے بیدار کرتی ہوئی انقلاب زمانہ کی طرف اس کا رخ موڑتی رہی اور آج بھی حالات حاضرہ سے قوم کو بیداری وہشیاری کی دعوت عمل دے رہی ہے۔

Tasneem Bano
C/o Firdaus Akhter
R/o 63/44 Colonelganj
Allahabad- 211002 (U.P)

فرہنگ آصفیہ سے

ارنڈ۔ ہ۔ اسم مذکر۔ (س۔ ای رنڈ) ایک درخت کا نام جس کے چوڑے چوڑے چروان پتے ہوتے ہیں۔ اور اسکے بیجوں کی گری کا تیل نکالتے ہیں۔ پنجابی میں ہرنول فارسی زبان میں اسے بید انجیر کہتے ہیں۔ اس کی جڑ نہایت بودی ہوتی ہے۔ ارنڈ کے بڑے بڑے پیڑ ایک ذرا سے جھٹکے کیساتھ جڑ سے اکھڑ آتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے ناپائیدار، چیز او رنوکری وغیرہ کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مزاجاً اول درجہ میں گرم خشک مائل بہ اعتدال

رینو بہل

کرپا

پردھان دین دیال شرما کی اکلوتی بیٹی سمیتا کی شادی کی تیاریاں ایک ہفتہ پہلے ہی شروع ہو گئیں۔ حویلی کو رنگ برنگی بجلی کی لڑیوں سے سجا یا گیا۔ گھر کے باہر گلابی رنگ کے جھالر والے شامیانے لگائے جا رہے ہیں۔ ہفتہ پہلے ہی ڈھولک اور گانے بجانے کا پروگرام شروع ہو گیا۔ شام سے ہی گاؤں کی عورتیں جوان لڑکیاں چھوٹی بچیاں حویلی میں جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ روشنی میں نہائی حویلی اور گانے بجانے کا منظر دیکھ کر لگتا ہے شادی پردھان کی بیٹی کی نہیں پورے گاؤں کی بیٹی کی ہے۔ جس راستے سے بارات نے آنا ہے وہاں سرکاری کارندے صاف صفائی کر کے سڑک کا کام کر رہے ہیں۔ اوبڑ کھابڑ راستے مکھن کی طرح ملائم بن گئے ہیں۔ شادی کے بہانے گاؤں کی قسمت بھی سنور گئی۔ پردھان کی ہر طرف واہ واہ ہو رہی ہے۔

پردھان دین دیال شرما کوئی چھوٹی موٹی ہستی نہیں ہے۔ آس پاس کے دو تین گاؤں میں ان کا بول بالا ہے۔ گاؤں کی آدھی سے زیادہ زمین اُن کے قبضے میں ہے۔ کچھ وراثت میں ملی تو باقی قرضہ وصول نہ ہونے کی وجہ سے قبضے میں لے لی۔ یہاں کے کسان پچھلے دو سالوں سے سوکھے جیسے ہی حالات جھیل رہے ہیں۔

اس سال بھی بارش ہوئی بھی تو صرف نام کی۔ نہ زمین کی پیاس بجھی نہ کسانوں کی مصیبت کم ہوئی۔ سرکار کی طرف سے کسانوں کو معاوضہ تو ملا مگر اونٹ کے منہ میں زیرا کے برابر۔ چھوٹے کسان کے لیے روزمرہ کے اخراجات اُس کی پہنچ سے باہر ہو رہے ہیں تو مزدوروں کے گھروں کے چولھوں سے اب ایک وقت ہی دھواں نکلتا ہے۔ ایسے میں پردھان کی بیٹی کی شادی کی عالی شان تیاریاں گاؤں والوں کے لیے چرچا کا مدعا بھی بن گیا ہے۔ سب کی زبان پر شادی کا ہی ذکر ہے۔

بڑے بزرگ چوپال میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں تو جوان لڑکیاں سمیتا کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان لڑکوں کو پردھان کی خوشامد کا اچھا موقع مل گیا ہے۔ پردھان کے دونوں بیٹے اُن لڑکوں سے خوب کام لے رہے ہیں اور دوسری طرف کرپا اور اس کی ٹولی کے لڑکوں میں بھی مستی، جوش اور اُمنگ پیدا ہو گیا جو بار بار اُنہیں پردھان کی طرف جانے کو اُکساتا ہے۔

آٹھ سال کا کرپا اپنے مزدور باپ مادھو کے ساتھ گاؤں کی سرحد پر بنی غریب بستی کے ایک کمرے کے کچے مکان میں رہتا ہے۔ اس بستی کے لوگوں کی حویلی تک رسائی نہیں ہے۔ اُن کا حویلی کے اندر جانا ممنوع ہے۔ صرف مزدور ہی وہاں جا سکتے ہیں اور باقی صرف دور سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ کرپا بھی اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں کی رونق دیکھنے صبح شام پہنچ جاتا ہے۔ بستی کے سبھی بچے سرکاری سکول میں پڑھنے جاتے ہیں۔ والدین کو اُن کو تعلیم دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر ایک وقت کے پیٹ بھر کھانے کے ساتھ مفت کتابیں، کاپیاں اور ہر روز کے حساب سے نقد ایک روپیہ نے اُنہیں مجبور کر دیا تھا۔ کرپا کا شمار ذہین اور پھر تیلے بچوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں اپنی عمر سے چھوٹا لگتا ہے۔ سانولا رنگ، کالی بڑی بڑی معصوم آنکھیں، دُبلا بدن۔ پچھلے سال زچگی کے وقت ماں چل بسی تھی۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری اب بابا پر آ گئی تھی۔ اُن کے ہاتھ کا بے ذائقہ کھانا بھی خوشی خوشی کھا لیتا۔ ماں کے گزر جانے کے بعد وہ یک دم سیانا ہو گیا تھا۔

باپ سارا دن گرمی، سردی، برسات، طوفان میں کسی طرح لوگوں کے کھیتوں پر مشقت کرتا ہے اور کتنی مشکل سے ایک وقت کی روٹی کما پاتا ہے۔ اس تکلیف کا احساس تھا اُسے۔ چھٹی والے دن وہ اکثر

باپ کے ساتھ جانے کی ضد کرتا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے باپ کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ مادھو اس کی خوشی کے لیے کچھ دیر تو ساتھ رکھتا پھر اُسے دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھیج دیتا۔ جانے سے پہلے وہ باپ سے وعدہ لینا نہ بھولتا کہ شام کو گھر دارو پی کر نہیں آئے گا۔ کرپا کی خوشی کے لیے مادھو ہفتے میں چار دن ناغہ کر لیتا۔ باقی دن بھٹی پر بنائی رمتے کی دیسی شراب گٹک کر غم غلط کرتا لڑکھڑاتے ہوئے گھر پہنچتا۔ اُس کی زندگی میں بھی کرپا کے علاوہ اور کوئی خوشی نہیں ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں سکول میں کیا ہوئیں مادھو کی پریشانی بڑھ گئی۔ پہلے کرپا کے صرف ایک وقت کھانے کی فکر ہوتی تھی اب صبح کی بھی ہوتی۔ دہاڑی پر مزدوری کرنے والے کو ہر روز نیا کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ پہلے مثلاً راشن کا انتظام پھر پکانے کی پریشانی۔ سوکھے کی وجہ سے کھیتوں میں کام ملنا کم ہو گیا ہے۔ مزدور شہر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ مادھو بھی دو وقت کی روٹی کمانے شہر جانا چاہتا مگر کرپا کو کس کے سہارے چھوڑ کر جائے۔ یہاں کچی پکی سر پر اپنی چھت تو ہے۔ اپنے لوگوں کا ساتھ تو ہے۔ کرپا کو مفت تعلیم کے ساتھ بھر پیٹ کھانا اور مہینے بعد بیس پچیس روپے نقد بھی مل جاتے ہیں۔ یہ گرمیوں کے دو مہینے کی چھٹیاں جیسے تیسے کاٹنی ہی ہوں گی۔ اب مادھو بیچ بیچ میں صبح شہر مزدوری کے لیے نکل جاتا اور رات واپس لوٹ آتا۔ کمائی کے کتنے پیسے آنے جانے کے کرائے میں خرچ تو ضرور ہو جاتے پھر بھی دو دن آرام سے گزر جاتے ہیں۔ ایسے میں پردھان دین دیال کے گھر مزدوری کا کام ملنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ مادھو خوش تھا کہ گاؤں میں ہی پردھان کے یہاں کام مل گیا اور کرپا اس لیے خوش تھا کہ اب باپ کے ساتھ وہاں جانے کا اُسے موقع مل جائے گا۔ وہ بھی شادی کی رونق اور گھر بار کی سجاوٹ قریب سے دیکھ پائے گا۔

صبح اٹھ کر اُس نے بھی ساتھ جانے کی ضد کی تو مادھو نے منع کر دیا۔ مجبوراً اُسے ہر روز کی طرح دوستوں کے ساتھ ہی دن گزارنا پڑا۔ سات دوستوں کی نٹ کھٹ ٹولی میں کرپا شرارت میں سب سے آگے رہتا۔ بنٹی، ربی، ٹکا، چرن سنگھ، میلا، ہن سب سکول کے ساتھی تھے۔ جب سے سکول میں چھٹیاں ہوئی تھیں پورا دن یہ سب گاؤں میں بھاگتے دوڑتے، پُرانے سائیکل کے ٹائر کو ڈنڈے سے چلاتے، ریس لگاتے، تالاب میں ڈبکی لگاتے، تیراکی کی ریس لگتی، تالاب میں ڈبکی لگا رہی بھینسوں کی پیٹھ پر چڑھ جاتے۔ گھاس چرتی گائے کو دیکھ کے دودھ دوہنے لگتے۔ سیدھی دھار منہ میں ڈالنے کا مقابلہ ہوتا تو کئی بار گائے کی دُلتی بھی پڑ جاتی۔ اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر مالک کی گالیاں اور ڈنڈے بھی کھانے پڑتے جو وہ ہنستے ہنستے جھیل لیتے۔

دوپہر کو کرپا کی ٹولی پھر شادی کی رونق دیکھنے پردھان کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں کی سجاوٹ اور میلے جیسی رونق دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ شامیانے میں حلوائی کے چولھے سے اُٹھتی طرح طرح کی خوشبوئیں اُن کی بھوک کو بڑھانے لگی۔ لذیذ پکوان کو قریب سے دیکھنے، سونگھنے اور چکھنے کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ یہ ہوا میں بکھری خوشبو اُن کے نتھنوں میں ہلچل مچانے لگی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے آج کل انہیں ہر طرف پکوان ہی نظر آتے۔ خیال آتے ہی پانی منہ میں بھر جاتا بات کرتے رال ٹپکنے لگتی۔ ابھی وہ شامیانے کے آس پاس گھوم کر خوشبو کا لطف اُٹھا رہے تھے سوچ رہے تھے کہ کس طرح کچھ کھانے کو ہاتھ لگ سکتا ہے کہ پردھان کے لٹھ باز گردھاری لال نے دیکھتے ہی اُنہیں مسکرا کر اشارے سے پاس بلایا۔ بڑے اشتیاق سے اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے ہنستے ہوئے ہن کا کان پکڑ کر اس قدر زور سے مروڑا کہ وہ درد سے چیخ اُٹھا۔

''اگر تم میں سے کوئی بھی لونڈا مجھے شادی تک آس پاس بھی نظر آیا تو تم لوگوں کا حقہ پانی بند۔''

بے چارہ ہن بُرا پھنسا۔ ظالم نے جب کان چھوڑا اُسے رہا کیا تو کان سرخ ہو چکا تھا۔ درد سے آنسو بہہ نکلے اور سبھی سر پر پاؤں رکھ وہاں سے بھاگ نکلے۔ اگلے دن پھر وہاں کیسے جلاد کی نظریں بچا کر جایا جا سکتا ہے یہ سب مل کر سوچنے لگے۔

اُس رات خیالوں میں کرپا شامیانے کے آس پاس ہی گھومتا رہا۔ لوازمات کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو اُس کے وجود کے ساتھ لپٹی رہی۔ پیٹ کی بھوک آنتوں سے ہوتی ہوئی پہلے دل پھر آنکھوں اور پھر دماغ پر چھا گئی۔ صرف کل کا دن تھا اُس کے پاس ان پکوانوں کا ذائقہ چکھ کر لطف اندوز ہونے کا۔ پیٹ سے زیادہ دل اور دماغ کو شرابور کرنے کا۔ پنڈال کے اندر تک رسائی صرف بابا کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔ اور بابا کو صبح کیسے راضی کرنا ہے ساتھ لے جانے کے لیے یہ سوچتے سوچتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی صبح جب کرپا سو کر اٹھا تو جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ اُسے سست دیکھ کر مادھو نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو جسم تپ رہا تھا۔ کام پر جانے سے پہلے وہ اُسے سرکاری ڈسپنسری لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے دوائی کی ایک خوراک اُس وقت کھلا دی اور باقی کی مادھو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ہدایت دی:

''دوا برابر کھلا دینا اور اگر بخار نہ اُترے یا جسم پر لال نشان اُبھر آئے تو اُسے فوراً ادھر لے آنا آج کل ڈینگو بخار بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور یہ جان لیوا بھی ہوسکتا ہے۔ خیال رہے دوائی کا ناغہ نہ ہو اور کھالی پیٹ نہیں دینی۔''

مادھو دوائی دلوا کر کرپا کو گھر چھوڑنے جانے لگا تو کرپا نے اُس کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ گھر پر بھی تو وہ اکیلے پڑا رہے گا کم سے کم وہاں پیڑ کے نیچے آنکھوں کے سامنے رہے گا تو اُسے بھی تسلی رہے گی۔ پھر دوپہر کی دوائی بھی خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلا دے گا۔ یہ ہی سوچ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

بارات کے استقبال کی تیاریاں زور شور سے چل رہی تھیں۔ مہمانوں کی گہما گہمی ہر طرف رونق، ہر طرف خوش رنگ لباس میں لپٹے خوش رنگ چہرے، پھولوں کی سجاوٹ، ڈھولک کی تھاپ، لذیذ پکوانوں کی میٹھی میٹھی مہک، کہیں کوئی بھاگ کر کام کر رہا ہے تو کہیں کچھ مہمان بیٹھے کھا پی رہے ہیں کہیں قہقہے گونج رہے ہیں۔ دور پیڑ کے نیچے کرپا بیٹھا یہ سب منظر دیکھ کر اپنا بخار بھول گیا۔ اسے لگنے لگا کہ وہ بھی اس ماحول کا حصہ ہے۔ وہ بھی میلے میں گھومنے آیا ہے۔ شامیانے میں حلوائی کی بھٹی سے اُٹھتی خوشبو اُس کے نتھنوں میں پھیلنے لگی۔ اُس کی بھوک بڑھانے لگی پھر بھی وہ ضبط کیے خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید اس کی ٹولی کے دوست اُس طرف سے نظر آ جائیں مگر کہیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ اگر وہ دوستوں کے ساتھ ہوتا تو اب تک کچھ نہ کچھ کھانے کا انتظام انہوں نے کر لیا ہوتا۔ بستی سے نکلتے وقت جن نے اُسے بابا کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تھا۔

دوپہر کو مادھو اُس کے پاس آ کر بیٹھا اور اپنی پوٹلی سے روٹی نکال کر اُسے کھانے کو دی تو کرپا نے کھانے سے انکار کر دیا۔ روٹی کھانی تو ضروری تھی بنا اُس کے دوائی کیسے کھا سکتا تھا۔ مادھو نے پھر دُلار سے پیار سے پچکار کر اُسے روٹی کھلانی چاہی تو اُس کے بھی دل کی بات زبان تک آ گئی۔ مادھو نے ڈانٹ کر اُسے بٹھا دیا۔ وہ بھی ضد پر اڑ گیا کہ وہ حلوائی سے اُس کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آئے نہیں تو وہ خود جا کر حلوائی سے مانگ لے گا۔ مادھو نے پھر پیار سے سمجھایا اُس کی توجہ بھی وہاں سے ہٹائی مگر بچے کی ضد نہ ٹوٹی۔ مجبوراً مادھو کو حلوائی کے پاس جانا پڑا۔

پنڈال میں کھانا بناتے حلوائی سے اُس نے کچھ کھانے کو مانگا تو اُس نے باورچی خانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''ابھی تو ادھر کچھ تیار نہیں تم اندر جا کر رسوئیے سے مانگ لو۔ اندر کھانا تیار ہے وہ دے دیگے۔''

وہ پچھلے دروازے سے رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے باہر سے ہی ''مہاراج، مہاراج'' کہہ کر رسوئیے کو پکارا۔ چولھے پر ہانڈی دیگ چڑھی ہوئیں تھیں۔ مسالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں تیر رہی تھی۔ پسینے سے بھرے چہرے کو گلے میں لٹکے گمچھے سے صاف کرتے ہوئے دوبارہ ''مہاراج'' کو پکارا۔ نہ کوئی جواب آیا اور نہ ہی کوئی دکھائی دیا۔ اس نے ایک قدم رسوئی کے اندر رکھ کر آگے جھک کر رسوئی کا جائزہ لینا چاہا تو سامنے سے آتے مہاراج نے اُسے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔

''رام رام رام رام۔ یہ کیا کیا تم نے؟ ساری رسوئی اشودھ کر دی۔ اب تو یہاں کھانا نہیں بن سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رسوئی سے نکل کر اندر کی طرف بھاگے۔

مادھو کے کھڑے کھڑے پسینے چھوٹنے لگے۔ اُسی لمحے وہ جلدی سے پلٹا اور کرپا کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ کرپا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے پردھان کے کارندے نے گردن سے آدبوچا اور اُسے گھسیٹتا ہوا پردھان کے پاس لے گیا جو شامیانے میں چار لوگوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ کرپا بھی ان لوگوں کے پیچھے بھاگا۔ مادھو پر نظر پڑتے ہی مہاراج چلّایا:

''یہ ہی ہے وہ کم ذات''

''کیوں بھائی مادھو تیری اتنی ہمت کہ تو منہ اُٹھائے ہماری رسوئی میں گھس آئے؟ اپنی اوقات بھول گیا کیا؟''

''مالک شما کریں میں نے تو رسوئی کے باہر سے ہی مہاراج کو پکارا تھا۔ میں اندر کیسے جا سکتا ہوں مجھے میری اوقات معلوم ہے سرکار۔''

مادھو دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ساتھ میں کرپا باپ کے کُرتے کا کونا پکڑے اس سے چپکا ہوا تھا۔

''جھوٹ بولتا ہے کم ذات میں نے اپنی آنکھوں سے تیرا ایک پاؤں اندر دیکھا تھا۔ آگے کو جھک کر نہیں دیکھ رہا تھا؟'' آنکھیں دکھاتے مہاراج نے پوچھا۔

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کچھ کہنے کو لب ہلے مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔

''ایسی کون سے آفت آن پڑی تھی کہ تو نہیں آوازیں لگاتا رہا تیرے سے انتظار بھی نہ ہوا جواب کا؟'' پردھان نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"مالک میرا بیٹا بیمار ہے دوائی دینی تھی۔ کچھ کھانے کی ضد کر رہا تھا۔"

"بیٹے کی ضد پوری کرنے کے لیے تو ہماری رسوئی میں منہ اُٹھائے چلا آئے گا؟"

"حضور میں تو ایسی اشودھ رسوئی میں کھانا نہیں بنا سکتا مجھے تو آپ معاف ہی کریں" مہاراج غصے سے پلٹ کر جانے لگا تو پردھان نے اُنہیں روکتے ہوئے کہا:

"مہاراج آپ شانت ہو جائیں ابھی رسوئی کی شُدھی بھی کرا دیتے ہیں پہلے اسے سزا تو ملنی چاہیے تا کہ اس جیسے کمین کو بھی سبق مل سکے۔"

"غلطی ہو گئی معاف کر دیں مالک۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔" مادھو گڑگڑاتا پردھان کے قدموں پر گر گیا۔

پردھان نے ٹھوکر مار کر اُسے پیچھے دھکیلا اور غصے سے گرجا:

"تو نے ہماری برادری کا دھرم بھرشٹ کرنے کی کوشش کی ایسے کیسے چھوڑ دوں تجھے"۔ اتنا کہتے ہوئے اُس نے منہ بھر کر تھوک زمین پر اُس کے آگے پھینکا اور چلایا:

"چاٹ اِسے۔ بڑی بھوک لگی تھی نہ تیرے بیٹے کو، اُس کی ضد پوری کرنے کے لیے ہمارا دھرم بھرشٹ کر رہا تھا نہ؟ لے اب چاٹ۔ سُنا نہیں میں نے کیا کہا؟"

وہاں کھڑے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ مادھو کا رنگ زرد پڑ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پردھان کو دیکھنے لگا۔ کرپا نے کس کر باپ کا کرتا پکڑ لیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے، چاٹ!" پردھان ایک بار پھر گرجا۔

"رحم مالک رحم" اس نے سر کی پگڑی اُتار کر پردھان کے قدموں میں رکھنی چاہی تو پردھان نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے وہیں روک دیا۔

"ایک منٹ میں خود ہی چاٹ ورنہ تیرے سپولے سے چٹواؤں گا"

مادھو نے بڑی اُمید سے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی اُس کی مدد کے لیے آگے آ جائے مگر سب خاموش تماش بین گونگے بہرے بنے کھڑے تھے۔ اُسے لگا وہ مردا بھیڑ میں تنہا کھڑا ہے۔ سب کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔

"گردھاری یہ ایسے نہیں مانے گا۔ پکڑ اس کے حرامی کو اور ادھر لا میرے پاس۔ باپ نہیں تو بیٹا یہ سزا بھگتے گا۔" پردھان نے لٹھ باز کو حکم دیا۔

"رُکیے صاحب یہ بچہ ہے اسے کچھ مت کہیے" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا تو کرپا نے زور سے باپ کا کُرتا کھینچ لیا۔ اُس کی طرف بنا دیکھے مادھو نے زور سے اپنا کُرتا اُس کی گرفت سے چھڑوایا اور دوزانوں بیٹھ گیا۔

جھکنے سے پہلے ایک بار پھر رحم کی اُمید میں پردھان کی طرف دیکھا۔ نفرت اور غصّے کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ زبردستی اپنے جسم کو آگے کی طرف جُھکانے کی کوشش کی۔ زمین پر تھوک کا گولا دیکھتے ہی اُبکائی آنے لگی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جسم سُوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ تھوڑا اور جھکا پھر اچانک کسی نے اُسے زور سے دھکا دیا اور وہ داہنی جانب لڑھک گیا۔ جب تک وہ سنبھلتا اور سمجھتا کہ کیا ہوا ہے کرپا پردھان کے منہ پر تھوک کر آندھی کی طرح وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

□□□

Dr.Renu Behl
#1505
Sector 49B
Chandigarh-160047 (Haryana)

فرہنگ آصفیہ سے

آدھے قاضی قدّوہ آدھے باوا آدم۔ کہاوت) (قدوہ) کثیر الاولاد بہت سے بیٹے پوتوں والا۔ کہتے ہیں کہ قاضی قدوہ کی بیوی ایک ایک دفعہ میں ستر ستر بیٹے جنتی تھی اس سبب سے لوگوں کا گمان ہے کہ دنیا کی آبادی بڑھانے میں قاضی قدوہ بھی نصف کے شریک ہیں۔ مصرع "قدوہ ممو دخلق میں آدم سے کم نہیں۔" کثیر الاولاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ہر بات کے ناقص رہنے پر بولتے ہیں۔ مگر ہمیں اس میں کلام ہے۔ کیونکہ قاضی قدوہ ایک کثیر الاولاد آدمی تھا۔

آدھی رات بارہ باٹ۔ ف۔ صفت۔ نہایت پریشان۔ خستہ حال۔ مضطرب احوال اس شخص کی مانند جو آدھی رات کے وقت ایسے موقع پر ہو جہاں سے مختلف سمتوں کو بارہ (یعنی بہت سے راستے جاتے ہوں اور اسے معلوم نہ ہو سکے کہ اسکی منزل مقصود کا کونسا راستہ ہے)

افسانہ

ڈلاری

نسرین بیگم (علیگ)

ہماری زندگی رسم و رواج کی پابندی، معاشرتی بندشوں سے اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ ہم کسی بھی طرح اپنے آپ کو آزاد نہیں سمجھ سکتے۔ ہم مذہب اور سیاست کے مختلف پہلوؤں، مختلف ضوابط میں گرفتار ہیں۔ اس غلامی سے ہمیں آزادی کب ملے گی؟ آزادی مل بھی پائے گی یا نہیں؟ جہیز سے آزادی، غریبی سے آزادی۔ غریبی کی وجہ سے جہیز نہ دینے پر آگ کے حوالے ہوتے ہوئے وہ بے بس جسم اور معصوم لڑکیاں جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ درندگی سے آزادی۔ مذہب کے چولے پہن کر غلط کام اور ہر مذہب کو بدنام کرنے والے، پارسا بننے والے لوگ جنھیں سمجھنا آسان نہیں، یہ کچھ اور نہیں عہد حاضر کا سوشل ڈرامہ ہے اور ہم اس ڈرامے کے کردار ہیں۔

ذکیہ اور رحیمن محو گفتگو ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ ارے لو، زمانے میں تو آگ لگ گئی ہے۔ بھئی ہمارے ملک میں ابھی مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف آواز اٹھانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ سماج یا مذہب کی اعلانیہ مخالفت کی جرأت کرنا فی الحال ہندوستان کی سرزمین میں بہت کم ہے۔ عہد حاضر کے سوشل ڈرامے میں روزمرہ کی نجی یا خانگی معاملات ڈرامہ نگار کے ارد گرد رہتا ہے۔ وہ اپنی سوچ سے باہر نکلتا ہی نہیں۔ مگر آج کیسی آگ لگی ہے۔ دولت کی چکا چوندھ میں لوگ اندھے ہو گئے ہیں۔ انھیں کچھ صاف نظر ہی نہیں آتا۔ بند کمروں میں غلط کام کرنے سے تو ڈرتے ہی نہیں۔

تو، تم بند کمرے کی بات کر رہی ہو، آج کل تو سب کچھ کھلے عام ہو رہا ہے۔ لوگ کسی سے ڈرتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں، سب مینیج ہو جائے گا۔ بس تھوڑا سا موقع ملا، پھر کہاں کوئی ہے جو ان درندوں کو روکے۔ ان کے جرم کی سزا ان کو دلوائے۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔

جو جرم کرتے ہیں اتنے برے نہیں ہوتے
سزا نہ دے کے عدالت بگاڑ دیتی ہے

یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر ان گنہگاروں کو ان کے کیے کی سزا ملنے لگے تو وہ ایسے گھناؤنے کام نہ کریں۔ مگر کہاں سزا و جزا، بلکہ وہ شان سے گھومتے پھرتے ہیں۔

رحیمن سنتے سنتے بول اٹھی۔

مینیج ہو گیا ہوگا۔ غریبی کا یہ حال ہے کہ دو وقت کی روٹی کے لیے چھوٹے چھوٹے بچے سڑکوں پر کوڑا چنتے نظر آتے ہیں۔ رات کے دو بجے سے ہی کوڑا چننے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ جب لوگ گہری نیند میں بستر کم خواب پر سنہرے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں اور یہ معصوم بچے گلی کوچوں، محلوں، نالیوں، سڑکوں، کوڑے دانوں میں جگہ جگہ کوڑے کے انبار سے اس طرح خوشی خوشی پلاسٹک اور دوسری چیز چنتے ہیں جیسے انھیں کوئی بڑی دولت ہاتھ لگ گئی ہے۔

یہ ان کا روز کا کام ہے۔ جس کو وہ پابندی سے کرتے ہیں۔ اگر نہ کریں تو پیٹ کیسے بھرے گا۔ مگر اس کے باوجود بھی یہ کوئی گارنٹی نہیں کہ دو وقت کی روٹی نصیب ہوگی یا نہیں۔

دلاری بھی کوڑا چننے والے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کوڑا چننے کا کام کرتی تھی۔ ایک روز کوڑا چنتے چنتے وہ بہت آگے نکل گئی۔ وہ اپنے قریب ایک لمبی گاڑی آتی ہوئی دیکھتی ہے، اس کے دل میں یہ گمان پیدا ہوا کہ یہ لوگ ہماری مدد ضرور کریں گے، یہ امیر لوگ ہیں۔ مگر گاڑی قریب آتی ہے، گاڑی کا دروازہ کھلتا ہے اور دلاری کو وہ لڑکے گاڑی کے اندر کھینچ لیتے ہیں۔ گاڑی کا شیشہ بند ہے اور A.C چل رہا ہے، گانے بھی بج رہے ہیں۔

پھر کیا تھا.........لڑکے انسانیت کا چولا اتار کر پھینک دیتے ہیں اور ذرا سی دیر میں انسان سے حیوان بن جاتے ہیں۔ دلاری کو ایسے نوچتے کھسوٹتے ہیں، جیسے کوئی ہڈی کتے کے آگے ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس ہڈی کا جو حشر کرتے ہیں اور بہت سارے کتے اکٹھا ہو جائیں اور پھر وہ جو کچھ کرتے ہیں بھوک کی آگ سے کھیلتے ہیں، غراتے ہیں، ہڈی کو حاصل کرنے کے لیے

یہ لڑکے دلاری کے جسم کو سگریٹ سے جلاتے جاتے ہیں کہ وہ بے بس ہو جائے اور انکار کی جرأت نہ کر سکے۔ وحشیانہ حرکت کرنے کے بعد کار کا دروازہ کھول کر دلاری کو سڑک کے کنارے دھکا دے کر بے یارومددگار چھوڑ جاتے ہیں۔

جب دو تین روز تک دلاری کا کچھ پتہ نہیں چلا تو اس کے والد اور ساتھ کے کوڑا چننے والے بچے اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ مردہ حالت میں پڑی تھی۔ انصاف کے لیے دلاری کے والد در در کی خاک چھانتے ہیں۔ مگر کوئی ان کی بات سننے کو بھی تیار نہیں۔ دھتکارتے ہیں کہ تم کنجڑوں کی اوقات ہی کیا ہے۔ چلے آتے ہیں منہ اٹھائے ہوئے، بے شرم......

مگر اس دنیا میں برے لوگوں کے ساتھ اچھے لوگ بھی ضرور ہوتے ہیں۔ مسز نغمہ جو ایک سماجی کارکن تھیں، بے سہارا، دبے کچلے لوگوں کی مدد کرتی رہتی تھیں، دلاری کو لے کر وہ نغمہ کے پاس جاتے ہیں اور سارا حال بیان کرتے ہیں۔ وہ انھیں تسلی دیتی ہیں۔ ہمت رکھو، تمھاری اس لڑائی کو ہم لڑیں گے۔ بس تمھیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ اگر تم کمزور پڑ گئیں تو ہم یہ جنگ ہرگز نہیں جیت سکتے۔

نہیں میڈم......ایسا نہیں ہوگا۔ دوسرے ہی دن نغمہ نے دلاری اور اس کے والد صابر کو میڈیا کے سامنے لا کر ساری باتیں بتائیں۔ دلاری کہتی ہے صاحب! میں ان لڑکوں کو پہچان لوں گی۔ جنھوں نے ہمارے ساتھ گھناؤنی حرکت کی ہے......اب FIR ایف آئی آر لکھ لیا جاتا ہے اور ان لڑکوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ چونکانے والی بات تو یہ تھی کہ ان لڑکوں میں ایک لڑکا منتری جی کا تھا۔ اب معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ ایک طرف غریبی یعنی سچائی دوسری طرف دولت، شہرت اور دبنگئی اور جھوٹ۔ جب جانچ پڑتال ہوئی تو منتری جی نے کہہ دیا کہ ان کا لڑکا نابالغ ہے۔

کورٹ نے سند پیش کرنے کو کہا۔ سند پیش کر یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ وہ نابالغ ہے۔ مشکل بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہ ثابت کرنا کہ وہ بالغ ہے۔

مگر آج بھی اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا ضمیر انھیں جھنجھوڑتا ہے کہ تم غلط کر رہے ہو وہ غلط کرنے سے رک جاتے ہیں۔

جس اسکول سے جعلی سند بنوایا گیا تھا، تلاش کرتے کرتے نغمہ وہاں پہنچ جاتی ہے۔ پرنسپل صاحب کا ضمیر انھیں اب آگے اور جھوٹ بولنے سے روکتا ہے اور وہ سب سچ بتا دیتے ہیں۔ ہاں! یہ سند جعلی ہے۔ ہم پر دباؤ بنا کر۔ جان سے مارنے کی دھمکی دے کر بنوایا گیا ہے۔ مگر اب کورٹ میں گواہی دینے کے لیے میں تیار ہوں۔ اس طرح پرنسپل صاحب کی گواہی سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ سند جعلی ہے۔ پھر پرنسپل کی ہی مدد سے صحیح سند مل جاتی ہے۔ اس طرح کورٹ میں گواہی اور سند پیش کرنے کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بالغ ہے۔

یہ سارے کام کرنے میں در در کی خاک چھانتے چھانتے پورے بارہ سال لگ جاتے ہیں اور دلاری پورے چوبیس سال کی ہو جاتی ہے۔ اس کے جسم پر سگریٹ کے نشان ابھی بھی باقی ہیں۔ جو اس حادثے کو یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اس عرصے میں نغمہ، دلاری اور اس کے والد کو جان سے مارنے کی دھمکی ملی، اسے دولت کی لالچ دے کر کیس واپس لینے کا دباؤ بنایا گیا۔ گویا سب کچھ دولت سے منتری جی خرید لینا چاہتے تھے۔ غریب باپ کی عزت، دلاری کی زندگی۔ مگر کبھی کبھی سارا داؤں الٹا پڑ جاتا ہے۔ دلاری اپنی ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ہر مشکل کا سامنا کرتی ہے۔ چاہے پولس اسٹیشن ہو یا پھر کورٹ، اخبار نویسوں یا میڈیا کے الٹے سیدھے سوالات!

یہ لمبی لڑائی وہ کسی طرح ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس دنیا میں ابھی کچھ اپنے لوگ ہیں، جن کے اندر انسانیت باقی ہے۔ لوگوں نے روپے اکٹھے کیے اور نغمہ کو دیا کہ آپ دلاری کا کیس لڑتی رہیں۔ دلاری کے والد کے پاس تھا ہی کیا! روز کوڑے چننا اور روکھی سوکھی کھا کر دن گزارنا۔

آج لوگ دولت کی چکا چوندھ میں اندھے ہو گئے ہیں۔ انھیں کچھ صاف نظر ہی نہیں آتا یا پھر وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ لوگ غلط کام کرنے سے نہیں ڈرتے۔ بارہ سال کا لمبا عرصہ دلاری اور اس کے والد نے خوف، بے بسی، مایوسی میں گزارا۔ کیا کوئی ان کے یہ دہشت کے بارہ سال خوشی میں بدل سکتا ہے؟

پورے بارہ سال کے بعد کورٹ کا فیصلہ آتا ہے کہ یہ چاروں لڑکے جس میں منتری جی کا بھی لڑکا تھا۔ ان کو سزا سنائی جاتی ہے، منتری جی کے لڑکے کو عمر قید کی سزا ہوتی ہے۔ دوسرے تینوں لڑکوں کو10-10 سال کی سزا ہوتی ہے۔

دوسرے روز یہ خبر اخبار کی سرخی بنتی ہے۔ 'بارہ سال کے بعد ملزم گرفتار، دولت مند باپ کا بیٹا، بچ نہ سکا۔ اس کو، اس کے کیے کی سزا آخر کار مل ہی گئی'

اس روز دلاری اس کے والد صابر نغمہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مگر اس خوشی میں درد تھا۔ دلاری بول پڑی، ہماری زندگی تو ختم ہو گئی۔ مگر نہ جانے کتنی دلاریاں اس طرح وحشی درندوں کے ہاتھوں شکار ہونے سے بچ جائیں گی۔

جس طرح چراغ خود تو جلتا ہے مگر دوسروں کو روشنی دیتا ہے۔ اسی چراغ کی طرح دلاری تھی۔ اس کے حوصلے اور ہمت نے ان وحشیوں کو جیل کی سلاخوں کے اندر کر دیا۔

مگر انصاف وقت پر مل جائے تو جرم بھی کم ہوگا اور پورے بارہ سال تک کسی دلاری کو مر مر کر جینا بھی نہ پڑے گا۔

Dr. Nasreen Begum

Head Deptt. of Urdu

Baikunthi Devi Girls (PG) College

Agra-282001 (U.P)

رخشندہ روحی مہدی

محبت

''ڈیڈی پلیز۔۔آپ ہی تو کہتے ہیں کہ انسان سب برابر ہیں۔''

''ہاں۔اب بھی کہہ رہا ہوں۔ لیکن میری بیٹی کی شادی اسکی برابری کے لڑکے سے ہوگی۔''

''ڈیڈی وہ بہت اچھا ہے۔آپ ایک بار مل تو لیں۔۔۔۔
آج میری ممی ہوتیں تو۔۔''

''اب یہ کہہ کے رومت دینا۔۔میں تمہارے آنسو۔او۔کے۔کل بلالواسے۔''

''لو بیٹا۔۔یہ تمہاری ممی کے زیورات ہیں۔۔اور یہ بینک کی پاس بک۔۔ آلوک میری سیما کا خیال رکھنا۔۔''

''یہ ہے ہمارا گھر۔۔آلوک اچھا ہے نا۔۔ڈیڈی نے میرے لئے بنوایا تھا۔۔میں کل سے اپنی جاب جوائین کرلونگی۔یہ لو تمہاری گھڑی اور سالیٹیر کی انگوٹھی۔۔یہ انگوٹھی ڈیڈی بیلجیم سے لائے تھے اور گھڑی دوبئی سے۔''

'' مجھے اب زندگی میں کچھ نہیں چاہئے۔۔تم ہونا آلوک میرے ساتھ''

'' آلوک ہم اپنی بیٹی کا نام آشا رکھینگے۔۔میری آشا۔۔''

''اماں خوش نہیں ہے۔۔بیٹے کا منھ دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔۔تینوں بھابھیوں کے یہاں پہلی بیٹی ہی ہوئی ہے۔۔''

'' اگلی بار آلوک۔۔''

میری آشا کو دیکھو۔۔بالکل تمہاری طرح ہے۔۔ہے نا۔۔''

''آشا آج چھ سال کی ہوگئی۔۔کیک اور ڈنر میں نے بنالیا ہے۔۔تم فکر نہ کرو۔۔میں نے آشا کے لئے بہت خوبصورت ڈول ہاؤس خریدا ہے۔۔میں نے کمیٹی ڈالی ہے۔ہر ماہ دوسو روپے ڈال دیتی ہوں۔۔یہ گھر کا سامان اور آشا کے اسکول کا خرچ ڈیڈی کی پنشن سے ہوتا رہا ہے لیکن اب ڈیڈی نہیں رہے تو میں نے شام کو ٹیوشن دینا شروع کردیا ہے۔۔
ارے۔۔آلوک لو یہ شرٹ میں تمہارے لئے لیتی آئی۔۔تم پر بہت سوٹ کرتا ہے نا یہ نیوی بلیو کلر۔۔''

''سگریٹ کیوں پیتے ہو اتنی۔۔اپنی صحت کا خیال رکھو۔۔میرا تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔۔''

''باہر جانے سے تمہارا دل نہیں بھرتا۔۔میں تمہیں کچھ کہتا نہیں تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ میں سمجھتا نہیں۔۔تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔۔تم نے اپنے ماحول کا مرد تلاش کرلیا ہے۔۔''

''پلیز۔۔آلوک ۔۔۔یہ سب مذاق نہ کیا کرو۔۔ڈیئر۔''

''یہ رات رات بھر کہاں رہتے ہو۔۔میں جانتی ہوں کہ تم صرف میرے ہو۔ مجھے بے پناہ چاہتے ہو۔۔اپنے آرام کا خیال رکھا کرو۔۔

''آلوک آشا کے اسکول گئی تھی میں۔۔اسکی ٹیچر اسکی بہت تعریف کرتی ہے۔۔آلوک ایک دن ہم دونوں آشا کے اسکول چلیں گے۔''

''اب خوش ہونا۔۔۔ہم اپنے بیٹے کا نام آدرش رکھیں گے۔''

''اب جو چاہو نام رکھو۔۔میری اماں دل میں پوتے کی خواہش لئے اس دنیا سے جاچکی ہیں۔۔''

آؤ۔۔آلوک تمہارے بال رنگ دوں۔۔سفید ہوگئے ہیں۔۔''

''تم اپنے بارے میں سوچو۔۔مجھے جوان بننے کا شوق نہیں۔۔''

''سنو۔۔تم میرے ہو۔۔صرف میرے ہو۔۔اگر تمہیں پسند نہیں تو میں اب بھی بالوں میں مہندی نہیں لگاؤنگی۔۔''

''میں تمہاری ہوں۔۔تم چاہتے ہو مجھے۔۔بے انتہا۔۔بے حد۔۔بے پناہ۔۔''

''آلوک آلوک۔۔۔۔وہ دکاندار ہے نہ اپنی کالونی میں۔۔۔وہ جو کونے میں چھوٹا سا اسٹور ہے نہ۔۔اسنے آج میرا ہاتھ پکڑ لیا۔۔شاید وہ نشے میں تھا۔۔''

'' جب ایسے ہیروئین بن کے باہر نکلوگی۔۔''

''اوہ ڈارلنگ۔۔آپ کی یہی لگاوٹ تو مجھے۔ ۔ اب کبھی میک اپ کو ہاتھ نہیں لگاؤنگی۔۔۔''

'' آدرش کے اس ٹیسٹ میں اچھے نمبر نہیں آئے۔۔بہت شریر ہوگیا ہے آدرش۔۔''

'' تم کو فرصت ہے۔۔ اپنے گل چھروں سے۔۔''

''ہاں۔۔سچ کہا تم نے ۔۔۔میں بچوں کو دیر رات تک نہیں پڑھاتی ہوں ۔۔کہ تمہاری نیند خراب نہ ہو۔اب میں کل سے بچوں کو انکے روم

میں دیر رات تک پڑھاؤنگی۔۔اور وہیں سو جایا کرونگی ۔۔جب تک دونوں بچوں کے امتحان نہ ختم ہوں''

'' آلوک ساری رات ٹی وی دیکھنے سے تمہاری آنکھیں کمزور ہو جائینگی۔۔دن بھر تم گھر میں رہتے ہو۔۔بور ہو جاتے ہو۔۔کبھی شام کو گھوم آیا کرو۔۔''

'' آلوک ۔۔کپڑے دھو کر پریس کر دئے ہیں۔۔کھانہ بنا دیا ہے۔۔بجلی٬پانی کے بل جمع کرتی ہوئی بچوں کو اسکول سے لیکر شام کو گھر آؤنگی۔۔''

''آلوک ہماری شادی کی ۱۸ ویں سالگرہ مبارک ہو۔''

''یہ لو میری طرف سے ۔کشمیری شال۔۔ٹی وی دیکھتے وقت تمہارے پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں نہ۔''

''ٹرن ٹرن۔۔''

''ارے گیتا۔۔سالی۔۔یہ کوئی وقت ہے گھنٹی بجانے کا؟؟ جاہل عورت۔۔''

''کیسا مرد ہے رے۔۔ساری زندگی جورو کے پیسے اڑاتا رہا۔شرم کرلے۔۔اب تو کچھ کمالے۔۔کچھ پتہ ہے تجھے تیری عورت تیرے لئے کیا کیا جتن کرتی ہے۔۔۔ایک میرا مرد ہے آج تک مجھے گھر سے باہر جانے نہیں دیا۔۔میں سیما کو ٹیوشن کے پیسے دینے آئی تھی۔۔اچھا ہوا جو تو مل گیا۔۔ڈوب کے مرجا دو چلو پانی میں۔''

''نازیہ ۔۔ہیلو۔۔''

'' آلوک پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔۔بچے اور میں اسکے سب دوستوں کو فون کر چکے ہیں۔۔''

''نہ۔۔نہ پولیس کو فون نہیں کرونگی۔۔میں انتظار کرونگی۔۔وہ میرا ہے۔۔صرف میرا۔۔لوٹ کر میرے پاس آئیگا۔۔''

''نہیں بھائی صاحب۔۔ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں۔۔آج پندرہ دن ہو گئے۔۔''

''جی آج فون آیا تھا۔۔مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔کہہ رہا تھا کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں۔۔میں نے اسکے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار روپئے ڈال دئے۔۔''

'' آلوک ۔۔اچھی شراب پیتا ہے نہ۔۔اور شیئر بازار میں اسکا کافی پیسہ لگا ہوا ہے۔۔''

''ہاں نازیہ۔۔یہ زندگی میں پہلا موقع ہے کہ میں آلوک سے دور ہوں''

''جو میرا ہے اسے کیوں بلاؤں۔۔خود ہی آجائیگا۔۔بے چارہ گھر میں اکیلا کب تک رہتا۔۔''

'' آلوک کے ساتھ کی عادت ہو گئی ہے۔۔اسکے کپڑے دھونا ۔۔اسکی من پسند کھانا بنانا۔۔اسکے چہرے کے روئیں روئیں میں اپنا عکس دیکھنا۔۔اوہ کہاں ہوگا۔۔کیسا ہوگا۔۔تم میرے مزاج سے واقف ہو۔ نازیہ۔۔میں اسکو جانتی ہوں وہ کسی دوسری عورت کا تصور تک نہیں کرسکتا۔۔اسکی آنکھیں صرف مجھے چاہتی ہیں۔۔آج ہم کئی سالوں سے الگ کمروں میں رہتے ہیں۔۔وہ مجھ پر بہت غصہ کرتا ہے۔۔لیکن ان تمام حالات سے گزرتے ہوئے بھی میں اسکے دل کی سچائی پر پوری طرح یقین رکھتی ہوں۔''

''ہیلو۔۔نازیہ ۔۔ابھی بینک کا نوٹس آیا ہے۔۔میرا مکان گروی ہے۔۔آلوک میرے دستخط بخوبی کاپی کرلیتا ہے۔''

'' آلوک کے پاس کوئی نوکری نہیں ہے۔۔اسنے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہوگا۔''

''اب تو ایک مہینے سے آلوک کا فون نہیں آیا۔نازیہ میں آج پولیس میں رپورٹ کرادوگی۔''

''ٹرن۔۔ٹرن۔۔''

''جی۔۔کہئے۔۔''

''مسز آلوک ہیں گھر میں۔۔میں انسپکٹر وجے کمار،،

''جی میں۔۔میں ہوں مسز سیما آلوک۔۔ ۔۔فرمائے''

''آپ میرے ساتھ چلئے۔''

''۔۔۔۔۔''

''شراب کی زیادتی کی وجہ سے آلوک کو اسٹروک ہو گیا۔۔''

''اس کی لاش مون لایٹ گیسٹ ہاؤس کے ٹائلٹ میں پڑی ہے۔''

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

'' یہ آلوک کا سامان۔۔اور یہ والیٹ '''' ۔۔۔۔۔''

''یہ پیکٹ اسکی جیب سے ملا ہے۔۔چار الگ کمپنیوں کے کونڈوم کے پیکٹ۔۔۔

ہر پیکٹ میں سے دو۔۔تین۔کونڈوم کم ہیں۔''

''۔۔۔۔۔۔''

''آلوک مجھ سے محبت کرتا تھا۔۔صرف مجھ سے۔۔''

Rakhshanda Roohi Mehdi

115 -A , Pocket-A, DDA Flats

Sukhdev Vihar, NEW DELHI-110025

احساس نایاب

غفلت میں جینے والو....

غفلت میں جینے والو دیکھو تو ایک نظر
قبر بلائیگی نہ عمر اور حیثیت دیکھ کر

وہ عید کی نورانی صبح تھی جو رات بھر کے لیے انتظار کے بعد سورج کی پہلی کرن، چڑیوں کی حمد وثنا اور ہواؤں میں تازگی لئے ہر سو رحمت بکھیر رہی تھی۔ ہم بھی نیم خم آنکھیں ملتے ہوئے خوشی خوشی بستر استراحت کو الوداع کہہ کر اپنے کاموں میں لگ گئے، کیونکہ عید کا دن ہوتا ہی مصروفیت سے بھرا ہوا، ڈھیر سارے کاموں کے بیچ مہمانوں کا آنا جانا، طرح طرح کے پکوان تیار کرنا، عزیز و اقارب، دوست احباب کا آنا اور پھر سب سے فارغ ہوکر کچھ خاص دوست احباب سے ملاقات کے لئے جانا، یہ سب عید کے دن کا عمومی معمول ہوتا ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر کے تمام مرد حضرات کو صبح عید کی نماز کے لئے عیدگاہ بھی جانا ہوتا ہے جس کی وجہ سے گھڑی کی سوئی چلتی نہیں دوڑنے لگتی ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھ کر ہم بھی جلدی جلدی تیار ہو گئے اور فجر کی نماز کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں شکرانہ ادا کیا، رمضان کے ساتھ عید کا دن جو ہمیں نصیب ہوا تھا اور آج کے دن ہر مسلمان کی طرح ہم بھی بہت پر جوش تھے۔ خوشی خوشی ایک کے بعد ایک اپنے کاموں سے فارغ ہو رہے تھے۔ گھر کی صاف صفائی کرنے کے بعد ہم نے کچن کا رخ کیا اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سب سے پہلے میٹھی سویاں بنائی، پھر ناشتہ کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ گھر کے باقی افراد بھی جاگ گئے اور وہ بھی عیدگاہ جانے کے لئے تیار ہونے لگے۔ سبھی نے ساتھ بیٹھ کر ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور سوئیاں کھا کر تکبیر پڑھتے ہوئے عیدگاہ کے لئے نکل گئے۔ سبھی کو سفید لباس میں نماز کو جاتا دیکھ کر ہمیں روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی، آخر یہ منظر ہوتا ہی کچھ ایسا خوشنما ہے کہ ہر طرف روحانیت اور نورانیت بکھر جاتی ہے۔ چاروں طرف مساجد میں اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے، جسے سنکر ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے، خود پہ فخر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں مسلمان کے گھر پیدا کیا اور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بنا کر بھیجا۔ سبھی کے رخصت ہونے کے بعد ہم واپس گھر میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ پڑوس سے زوردار چیخنے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی جسے سنکر ہم گھبرا گئے، دل دہل گیا، فوراً بالکنی سے جھانک کر چیخ کی وجہ جاننی چاہی تو نیچے کے منزل والی حسینہ خالا نے کہا کہ کچھ نہیں یہ آواز تو مہک کے گھر سے آئی ہے، شاید بچے ادھم کود مچا رہے ہونگے، انہیں نہ رمضان کا لحاظ تھا نہ عید کے دن کا، جب دیکھو اسی طرح کا شور وغل ان کے گھر کا معمول ہے، یہ کہتے ہوئے حسینہ خالا طنزیہ لہجے میں چڑچڑاتے ہوئے اور ہمیں کچھ نہ ہونے کا یقین دلاتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوگئیں اور ہم بھی دروازہ بند کر کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی، دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ کچھ ہوا نہیں ہے، بس رہ رہ کر مہک کی یاد آ رہی تھی، کیونکہ چیخ بچوں کی نہیں بلکہ مہک کی آواز میں تھی، مگر عید کا دن ہونے کی وجہ سے ہم جا بھی نہیں سکتے تھے، آخر لوگ کیا سمجھیں گے کہ اس عورت کو عید کے دن بھی ادھر ادھر گھومنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے، یہی سوچ کر ہم نے جانا بہتر نہیں سمجھا ویسے بھی حسینہ خالا کا گھر مہک کے گھر سے زیادہ قریب ہے، خیر خود کو دلاسہ دیتے ہوئے ہم دوبارہ اپنے کاموں میں مگن ہو گئے۔ کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود بھی رہ رہ کر وہ چیخ ہمارے کانوں میں گونج رہی

تھی، جیسے وہ ہمیں کچھ کہنا چاہتی ہے، ہمیں بلا رہی ہے، آخر کار ہم سے رہا نہیں گیا، جی بہت گھبرا رہا تھا، اسلئے ہم نے فون کرنے کا فیصلہ کیا، جلدی جلدی مہک کے نمبر پہ کال کیا، لیکن کافی دیر تک گھنٹی بجنے کے بعد بھی دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں ہوا تو ہمیں خود کی بیوقوفی پہ ہنسی آنے لگی، کیونکہ عید کے دن تمام عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتی ہیں اور ہمارا اسطرح بار بار کال کرنا کہیں مہک کو برا نہ لگ جائے یہ سوچ کر ہم نے اپنے دل کو منا لیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور ہم دوبارہ کچن میں چلے گئے، انہیں کاموں کے بیچ وقت کیسے گذرا پتہ ہی نہیں چلا۔ جب کاموں سے فراغت ہوئی تو دیوار پہ لگی گھڑی پہ نظر پڑی، دوپہر کا ایک بج رہا تھا، اتنا وقت ہوتا دیکھ کر ہم پھر سے پریشان ہو گئے کیونکہ عیدگاہ سے مرد حضرات ابھی تک لوٹے نہیں تھے۔ عیدگاہ سے لوٹنے میں اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوتی تھی، نماز کے فوراً بعد دوستوں سے مصافحہ کر کے لوٹ آتے ہیں، لیکن آج اتنی دیر، پتہ نہیں کیوں؟ آج صبح سے سب کچھ عجیب ہو رہا تھا ایک تو صبح کی چیخ اور ابھی عیدگاہ سے مرد حضرات کا نہ لوٹنا دل بے چین ہو اٹھا، جیسے کہیں کچھ ہونے والا ہے۔ ہم نے اپنا موبائل اٹھایا اور اپنے کزن بھائی کو کال کرنا چاہا لیکن ان کا موبائل بھی سوئچ آف بتا رہا تھا، ایک تو ٹینشن اوپر سے موبائل کا سوئچ آف ہونا بہت جان لیوا تھا، دوسرے نمبر پہ کال کرنا چاہا تو سبھی کے موبائل گھر پہ ہی تھے، ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا کریں؟ کس سے دریافت کریں؟ آخر اتنی تاخیر کیوں ہو گئی؟ ایک تو ٹینشن اور اس سے بڑھ کر یہ دل بہت گھبرا رہا تھا جسکی وجہ سے ہمیں شدید غصہ بھی آ رہا تھا، ہر سال تو جلدی ہی لوٹ آتے ہیں، لیکن آج اتنی دیر کیوں؟ اگر دیر کرنی ہی تھی تو اطلاع تو کر دیتے، یہی بڑبڑاتے ہوئے باہر کا جائزہ لینے کے لئے ہم بالکنی میں واپس آئے اور ادھر اُدھر کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ مہک کے گھر میں لوگوں کی بھیڑ جمع نظر آئی، ہم نے جلدی سے حسینہ خالا کو کال کیا اور باہر آنے کے لئے کہا، ہمارے کہنے پہ حسینہ خالا بھی باہر آ گئیں اور وہ بھی مہک کے گھر میں جمع بھیڑ دیکھ کر پریشان ہو گئیں، ہم اور حسینہ خالا کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ اس سے پہلے دروازہ پہ دستک ہونے لگی، ہم نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو دروازہ پہ ہمارے چچازاد بھائی سلیم تھے، انہیں دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی لیکن ان کے چہرے پہ غم اور اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے، انہوں نے بڑے پریشان لہجہ میں مہک کے بارے میں بتایا کہ باجی پڑوس کی مہک آپا صبح فرش پر پیر پھسلنے سے گر گئیں، سر میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے کان ناک سے خون لگاتار بہہ رہا ہے، یہاں تک کہ ڈاکٹر نے بھی جواب دیدیا ہے۔

سلیم کی باتیں سنکر ہمارے ہوش اڑ گئے، کانوں میں صبح کی چیخ دوبارہ گونجنے لگی، مہک کا ہنستا کھلکھلاتا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا اور ہم خود پہ قابو نہ پا سکے، فوراً حجاب پہنا اور لرزتے قدموں سے مہک کے گھر کی طرف چل پڑے، جیسے جیسے ہم قدم بڑھا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ شدت غم سے ہمارے قدم بوجھل ہو گئے ہیں، پیروں میں کسی نے بھاری بھاری پتھر باندھ دئے ہیں، بڑی مشکل سے جیسے تیسے بھاگتے، گرتے پڑتے مہک کے گھر تک پہونچے اور بے خودی کے عالم میں لوگوں کی بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے جب ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو سامنے کا منظر دیکھ کر ہمارے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی، مہک جو آدھی رات تک ہمارے ساتھ تھی، ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے دیر رات تک ہاتھوں میں مہندی لگاتے رہے، عید کی تیاریوں کے سلسلے میں ڈھیر ساری باتیں کی، ہنسی مذاق کرتے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے، آج وہی مہک خون سے تر بتر ہماری نظروں کے سامنے اپنی بے جان پڑی تھی، اس کی ابتر حالت دیکھنے کے بعد ہمارا جسم تھر تھر کانپنے لگا، آنکھیں پتھرا گئیں اور آنسوؤں نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی، ہمارا درد، ہمارا خوف، ہماری گھٹن ہمارے ہی اندر چیخ و پکار کرنے لگی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ایک ہی پل میں ہماری بھی سانسیں دب جائیں گی، ہم لڑکھڑا کر گرنے ہی والے تھے کہ پاس میں کھڑی حسینہ خالا نے ہمیں تھام لیا اور دیوار کا سہارا دیکر ہمیں ایک کونے میں بٹھا دیا۔ ہم مہک کے بے جان جسم کو لگاتار گھور رہے تھے، آخر مہک ہماری خاص سہیلی جو تھی، اور ہم دونوں اکثر ہر جگہ ساتھ رہا کرتے تھے، بہت پیاری اور زندہ دل تھی مہک کو پہننے، اوڑھنے اور کھانے پینے کا بہت شوق تھا، ہمیشہ ہم سے یہی کہتی کہ فوزیہ جب تک اللہ نے زندگی دی ہے زندہ دلی سے جی لو، گھومو، پھرو، کھاؤ، اچھے لباس پہنو، تاکہ مرتے وقت کوئی خواہش باقی نہ رہ جائے۔ کل کا کیا پتہ کہ کب موت آ جائیگی؟ تو ہم مہک کی اس بات پہ مسکراتے ہوئے ان سے یہ کہتے کہ اللہ کی بندی! ہماری جان جب مرنے کا اتنا یقین ہے، تو رمضان کے روزے بھی رکھ لو، گھومنے، کھانے، شاپنگ کے ساتھ ساتھ تھوڑا اللہ کو بھی تو یاد کر لو، ہماری اس بات پہ وہ ہنستے ہوئے کہتی کہ فوزیہ میری جان اگلا رمضان آئے گا، نہ اُس وقت پورا رمضان، عبادت اور روزوں میں گذارونگی ابھی عمر ہی کیا ہے، ہم مہک کی ان باتوں پہ متعجب ہو کر انہیں دیکھتے رہے، تھوڑی دیر پہلے موت کو یاد کرنے والی ابھی اگلے رمضان میں عبادت کی بات کر رہی تھی، خیر مہک سے باتوں میں جیتنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی، اسلئے ہم اکثر ایک دو بار کہہ کر خاموش

ہو جاتے، لیکن آج نظروں کے آگے مہک کی لاش کو دیکھ کر ہمیں انکی ایک ایک بات یاد آرہی ہے، وہ عید کو لیکر کتنی خوش تھی، شعبان سے انہوں نے عید کی تیاریاں شروع کردی تھی اور رات میں ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر مہندی بھی لگوائی تھی، اسی دوران عید کو لیکر ان کے اتاولے پن کو دیکھ کر ہم نے انہیں چڑھاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ عید تو روزہ داروں کے لئے ہے، آپ کیوں اتنے انتظار میں ہو؟؟ ہماری اس بات کا جواب مہک نے کچھ ایسا دیا کہ فوزیہ جان عید تو انہیں کی ہے جنہوں نے اسکی تیاری میں اسکے انتظار میں پورا بازار خرید اہو، مہک کی باتیں سنکر ہم ہنسنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکے اور اسی طرح ہم دونوں ہمیشہ کسی نہ کسی بات کو لیکر ہنستے رہتے، لیکن اُس وقت ہم نے یہ بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ اس قدر ہنس مکھ، ہماری اتنی پیاری سہیلی آج ہماری ہی نظروں کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سانس لے گی، وہ بھی صرف پیر پھسلنے کی وجہ سے، جو جسم نہ کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کبھی بخار تک آیا ایسے جسم کو بھی ایک دن بے جان ہونا ہے، اس حقیقت کو دل ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا، دل تو کر رہا تھا کہ مہک کو آواز دیکر اٹھائیں، یا وہ خود تھوڑی ہی دیر میں اُٹھ کر ہمیں پکاریں گی، لیکن نہیں ہم خود کو جھوٹی امید دلا رہے تھے، آج ہماری مہک ہم سے ہمیشہ کے لئے دور ہوگئی ہے وہ اب کبھی ہمارے پاس نہیں آئیگی نہ ہی کبھی ہمیں چڑھائیگی، اب ہمارے درد کا باندھ ٹوٹنے لگا، ہماری گھٹن ہچکیاں بن کے نکلنے لگیں، جب ہم نے مہک کے مہندی سے رچے سرخ ہاتھوں پہ خون کی سرخی کو بکھرے ہوئے دیکھا، جب ان کے جسم کو نہلانے کے لئے اٹھایا جا رہا تھا تو چہرے پہ پڑا کپڑا کھسکنے سے انکا چہرہ نظر آیا، وہ چہرہ جو دو دن پہلے عید کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے مہنگے پارلر میں مساج فیشیل بلیچ وغیرہ کروایا ہوا تھا، جسکی وجہ سے چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا وہ ایک ہی پل میں بے نور ہو چکا تھا، سر پہ چوٹ لگنے کی وجہ سے پورا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا، سارا حسن آخری سانس کے ساتھ ختم ہو چکا تھا، اس مٹی کے جسم نے آج اپنی پہچان تک کھودی تھی جو کچھ دیر پہلے سب کے لئے ہر دل عزیز تھا، ماں باپ کی لاڈلی بیٹی، شوہر کی زندگی، بچوں کی ماں تھی وہ آج اپنے ہر رشتے کی پہچان کھو چکی تھی، یہاں تک کہ پیدائش کے فوراً بعد کان میں اذان پکار کے جو نام رکھا گیا تھا، جو ساری زندگی انکے وجود کی پہچان تھا آج وہ بھی ختم ہو چکا تھا اور مہک آج مہک سے صرف ایک میت بن کر رہ گئی تھی ۔ مہک کہلانے والی ہنستی کھلکھلاتی سہیلی جو حقیقت میں مہک ہی تھی جہاں بھی جاتی اپنے حسن، اپنی گفتگو اور اپنی زندہ دلی سے ہر محفل ہر ویرانے کو مہکا دیتی، آج اسی کا گلشن ویران ہو چکا تھا اور اس مہک کو میت کے نام سے بلایا جا رہا تھا، سارا حسن ایک ہی پل میں فنا ہو چکا تھا، جو پورا رمضان عبادتوں کو چھوڑ کے، روزوں کو ترک کر کے صحت کے نام پہ عید کی تیاریوں میں گذرا تھا وہ ساری کی ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ گئی، جن بچوں، شوہر اور دوست احباب کی خوشیوں کی خاطر ڈھیر ساری شاپنگ کر رکھی تھی وہ سارا سامان ایک کونے میں بکھرا پڑا تھا، اس سے جڑی انکی خوشی، سارے ارمان مر گئے تھے، پورے گھر میں خوشیوں کی جگہ ماتم پسرا ہوا تھا اور دنیائے فانی کی حقیقت دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار تھی، جس حسن، دولت، شہرت والی زندگی پہ ہر کسی کو ناز ہوا کرتا ہے، آج اُس کی اوقات نظروں کے آگے تھی اور ہر انسان اس حقیقت کو ماننے پہ مجبور تھا کہ زندگی پانی کے بلبلے سے بڑھ کر کچھ نہیں، اسکو جتنی بھی محبت سے اپناؤ، یہ ایک نہ ایک دن ختم ہونی ہے، مٹی سے بنا جسم لاکھ سنواریں سجائیں، ایک دن اس کو لحد میں سونا ہی ہے، چھوٹی سی چیونٹی اور مچھر کے کاٹنے کا درد برداشت نہ کرنے والے اس جسم کو ایک دن کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننا ہی ہے۔

اس لئے اس فانی دنیا کی چاہت کو اس قدر خود پہ حاوی نہ ہونے دیں کہ حقیقی زندگی کو ہی بھلا دیں، کیونکہ دنیا میں ہر انسان کی آخری منزل قبر ہے، جہاں پہنچنے کے لئے اس کو مال وزر یا نام و شہرت اور حسن کام نہیں آئے گا بلکہ اسکی منزل کے لئے اسکے اعمال ہی اسکے ساتھ ہوں گے، ابھی تو ہم دنیا کی محبت میں اندھے ہو چکے ہیں، غفلت میں ڈوب چکے ہیں، لیکن وہ دن دور نہیں جب ہمیں اللہ کے حضور کھڑے رہنا ہے اور وہاں ہمارے اعمال کی ذمہ داری صرف ہم پہ ہوگی، نہ ماں باپ ساتھ آئینگے نہ دوست احباب ساتھ ہونگے، بس وہاں تو ہمیں اندھیرے لحد میں تنہا لیٹنا ہوگا اور ہماری عبادات، ہماری نیکیاں اور بدیوں کے بیچ کا ماپ تول ہوگا اور ہمارے جسم کے ہر اعضاء کو زبان دی جائیگی، جو ہمارے اعمال کی صحیح گواہی دیں گے، اس لئے وقت رہتے اپنے اعمال کو نیک بنالو تاکہ موت بھی آئے تو ہم تیار رہیں اور ہنستے ہنستے اللہ کے حضور کھڑے رہیں، جنت کے باغات کے مزے لے سکیں اور ہمیں وہاں اپنے گناہوں، اپنی غلطیوں کی وجہ سے شرمندگی، رسوائی اور جہنم کا عذاب نہ جھیلنا پڑے کیونکہ اُس وقت تک تمام مواقع ختم ہو چکے ہوں گے......

Ehsas Nayab
C/o. Mohammed Asif
S/o Mohammad Ghaus
K.R Puram Ext. Near Ram Temple
Shimoga-577202 (Karnataka)

ہاتھ جلے گھر کے چراغ سے

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

موسم گرما جاری تھا اور گرمی اپنے شباب پر تھی۔۔۔۔ ہر کوئی پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور ہم اندر ہال میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہے تھے۔۔۔ ابھی ظہر کی اذان ہونے میں بھی وقت تھا اس لیے اٹھ کر گیلری میں آ کر کھڑے ہوئے کہ تھوڑی باہر کی ہوا میں سانسیں لے لیں۔ باہر کی چلچلاتی دھوپ میں نکلنے کے تصور سے ہی جھرجھری آ گئی۔ باہر ہوا تو تھی لیکن وہ بھی گرم۔۔۔۔ ہمیں وہاں کھڑے کچھ ہی وقفہ گزرا ہوگا کہ ہمارے کانوں میں ایک صدا سنائی دی، ''تکیے کے کور لے لو، گدے کے کور لے لو۔'' ہم نے نیچے دیکھا تو ایک ضعیف اور کمزور آدمی ایک ہاتھ میں تکیے کے کور لیے اور کندھے پر گدے کے کور ڈالے کھڑے ہوئے تھے۔۔۔ ان کے دوسرے کندھے پر ایک آسمانی رنگ کا بڑا سا جھولا لٹک رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ اپنی صدا لگاتے جا رہے تھے۔ ہم نے انہیں آواز دی۔۔۔

''چاچا جی! رکئے۔''

ہم نیچے اترے اور ان کے پاس موجود کور دیکھنے لگے۔ ہم نے پوچھا، "چاچا جی! کیسے دیئے تکیہ کور اور گدے کے کور۔'' ہمیں وہ چیزیں پسند آ گئیں تھیں اس لیے دام پوچھا تھا۔ انہوں نے تکیہ کور کے پچاس روپے جوڑی اور ایک سو پچیس روپے کا ایک گدے کا کور کا دام بتایا۔۔۔ سائز چھوٹی تھی مگر کوالیٹی بہتر تھی اس لیے ہم نے بغیر کسی قسم کی سودے بازی کیے دو جوڑی تکیہ کور لے لئے۔ ہمارے اس رویے سے ان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ہم نے ان سے پوچھا، "چاچا جی! پانی پئیں گے؟'' انہوں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم اندر آئے اور فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالی۔۔۔۔ گلاس کی ٹھنڈک محسوس کر انہوں نے جلدی سے اسے منہ سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں پورا پانی پی گئے۔ انہوں نے خالی گلاس بڑھایا اور دوبارہ پانی مانگا۔ ہم نے پانی دیا تو انہوں نے تھوڑے پانی سے اپنا منہ دھویا۔

جب ہم نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ ایک دم نڈھال سے تھے مگر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اور آدھے گلاس پانی سے منہ دھو کر لگا ان کے چہرے پر زندگی دوڑ گئی۔ ہم نے ان سے پوچھا،'' چاچا جی! آپ اس عمر میں اور اتنی چلچلاتی دھوپ میں کیوں گھوم رہے ہیں؟؟؟ آپ کو اپنی حالت کا احساس بھی ہے۔''

ایک سرد سی آہ ان کے منہ سے نکلی اور بولے،'' بیٹی! اس پاپی پیٹ کے لئے کام تو کرنا پڑتا ہے نا!!!!'' دھوپ میں نہیں نکلا تو کھاؤں گا کیا؟؟؟

''کیوں آپ کے بچے نہیں ہیں؟؟؟''

یہ سن کر بولے،'' الحمدللہ! بچے بھی ہیں۔۔۔۔۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔''

''اور آپ کی بیوی کہاں ہے؟؟؟''

ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور دھیمے سے بولے،''

"وہ تو کب کی مجھے دنیا کے غم کھانے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔''

''چاچا جی! ایک بات پوچھیں آپ سے؟'' ہمارا سوال سن کر ایک لمحہ رک کے پھر بولے،'' ہاں بیٹا! پوچھو!!''

''آپ اپنے بچوں کے ساتھ نہیں رہتے؟؟'' ''بیٹیاں تو اپنے اپنے سسرال کی ہوگئی ہیں۔ بیٹا ہے تو وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہے!!!''

''تو آپ اپنے بیٹے کے ساتھ نہیں رہتے کیا؟؟'' ہمارا سوال جیسے ان کے دل میں زخم لگا گیا۔ اپنا سامان سنبھالتے ہوئے بولے،

''جانے دو بیٹی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔تم بتاؤ کچھ اور لینا ہے؟''
محسوس ہوا کہ وہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم نے بھی موضوع بدل دیا اور بولے،
''جی چاچا جی! آپ ہمیں اس سے تھوڑے بڑے گدے کے کور لا دیجیے۔''
''اچھا بیٹی! چار پانچ دن میں لا دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے سلام کیا اور چلے گئے۔
ہم ان کی باتیں سن کر پریشان ہو گئے۔دماغ میں مسلسل ایک بات گھوم رہی تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہا؟
آخر کیا بات تھی؟؟؟؟
اندر آکر نماز ادا کی ،کھانا کھایا اور تھوڑا آرام کرنے بستر پر آ گئے۔اب آرام کہاں۔رہ رہ کر چاچا جی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ان کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوئے جا رہے تھے۔نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔
شام میں ہمیں ایک دوست سے ملنے جانا تھا۔ملاقات شام چھ بجے ایک کافی شاپ میں طے ہوئی تھی۔یوں ہی پڑے پڑے عصر کا وقت ہوا۔نماز ادا کی اور چائے پی کر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔گھر میں بچوں سے کہہ دیا کہ ہم آٹھ بجے سے پہلے ہی آجائیں گے۔سڑک پر آئے، آٹو کیا اور کافی شاپ پہنچ گئے۔۔۔ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی مسز مدیحہ کامران وہاں پہنچ چکی تھی۔ہم دونوں کافی شاپ کے اندر جا بیٹھے۔ہم اپنی باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہماری نظر ایک بہت ہی پرانی سہیلی پر پڑی۔۔۔ہماری شادی کے فوراً بعد ہی ان کی بھی شادی ہو گئی تھی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مصروف ہو گئیں اور ہم اپنی۔آج کئی سالوں بعد انہیں دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ہم نے سوچا انہیں سرپرائز دیں۔۔۔۔اس لیے ہم مدیحہ کامران سے پانچ منٹ میں آتے ہیں کہہ کر اٹھ گئے اور اپنی سہیلی کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔دھیرے سے آواز دی،
''شمع۔۔۔
کیسی ہیں؟
''شمع چونک کر پیچھے مڑیں اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا،
''ارے زویا!تم؟ یہاں؟۔۔۔کیسی ہو؟
کہاں تھی یار اتنے سالوں تک؟؟؟؟'' ہنستے ہوئے ہم نے کہا،'' ہم اچھے ہیں یار۔آپ کیسی ہیں اور آپ اتنے برسوں کہاں تھیں؟۔۔۔آپ بھی تو لاپتہ ہو گئی تھیں!!!!''
وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ تھیں۔انہوں نے ہمیں اپنے بچوں سے ملایا تو ہم نے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں۔
''شمع! آپ یہاں آجائیں۔ہماری ایک اور ساتھی وہاں بیٹھیں ہیں۔'' ہم نے دونوں کا تعارف کرایا۔خوب باتیں ہوئیں اور کچھ دیر بعد مدیحہ کامران نے ہم سے رخصت لی۔پھر ہم دونوں سہیلیاں برسوں کے گلے شکوے دور کرنے لگیں۔۔۔دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے فون نمبر دیئے۔۔۔۔ایک دوسرے کو اپنے اپنے گھر پر آنے کے لئے مدعو کیا اور اللہ حافظ کہہ کر ہم کافی شاپ سے باہر نکل گئے۔۔۔
شام ڈھل چکی تھی۔رات کی کالی چادر پھیل چکی تھی۔۔۔۔ہر کوئی اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہا تھا۔۔۔ہم آٹو میں بیٹھے اور اپنے گھر واپس آگئے۔
کھانے پر ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔فریش ہوئے اور کھانے پر بیٹھے۔اس دوران ہم نے سب کو بتایا کہ ہماری ایک سہیلی سے بہت سالوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔کھانے سے فارغ ہو کر دن بھر کی مصروفیت ایک دوسرے سے شیئر کیں اور سب اپنی اپنی آرام گاہ میں چلے گئے۔
اب ہر روز ہماری شمع سے بات ہونے لگی۔اپنے گھر پریوار کے بارے وہ ہمیں بتاتی ہم انھیں بتاتے۔وہ اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔۔۔ساس انتقال کر گئی تھی اور سسر کہیں باہر رہتے تھے۔ہم نے انہیں بتایا کہ الحمدللہ ہماری جوائنٹ فیملی ہے۔اس دن ہم فون پر باتیں کر ہی رہے تھے کہ نیچے سے کسی نے آواز دی۔شمع سے معذرت کرتے ہوئے ہم باہر آئے اور نیچے دیکھا۔وہی کور فروخت کرنے والے چاچا جی تھے۔ہم نے شمع سے کہا کہ فون رکھتے ہیں، انشاءاللہ ہم کل دوپہر کے کھانے پر آپ کے گھر ضرور آئیں گے۔ہم نے آپ کی دعوت قبول کر لی۔لیکن ہم صرف اکیلے آئیں گے آپ کچھ تکلف نا کریں۔'' اور اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔
''کیسے ہیں چاچا جی!!لائے آپ گدے کے کور؟؟؟''
''ہاں بیٹی! تین لائے ہیں۔سائز وہی ہے جو تم نے بتائی تھی۔''
''جی ٹھیک ہے۔لائیے!!!'' اس مرتبہ کور کی کوالیٹی اور اچھی تھی۔
ہم نے پوچھا،'' آپ خود سیتے ہیں کیا؟؟؟'' بولے،''نہیں۔ایک گارمینٹ والا ہے۔وہ کٹنگ کر کے بچے ہوئے کپڑوں سے تکیہ کے اور گدے کے کور بناتا ہے۔۔۔میں وہاں سے لے کر بیچتا ہوں۔''

''آپ کو اس سے اچھا منافع ہوتا ہوگا؟؟؟''
مسکرائے اور کہا،''گدے کے کور میں پچیس روپے اور تکیہ کور میں بیس روپے ملتے ہیں!!!''
''یا اللہ! اتنے پیسوں کے لئے آپ اس سخت گرمی میں گھوم رہے ہیں؟؟؟ اس گرمی سے آپ کی تو حالت خراب ہوجاتی ہے۔''
''کیا کروں بیٹی۔ مجبوری ہے۔۔۔۔۔پیٹ کی بھوک کو تو مٹانا ہی ہے نا!!!''
''چاچاجی! آپ نے بتایا نہیں آپ کا بیٹا کہاں ہے؟ آپ کو اسطرح چھوڑ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔''
ٹھنڈی سانس لے کر بولے،''کیا اچھا۔۔۔کیا برا۔۔۔۔۔اگر لوگ سمجھ پاتے تو پھر یہ سب ہوتا ہی کیوں!!!''
''کیا انہیں اولاد نہیں ہے؟؟؟''
''اللہ کے فضل سے بیٹی بیٹا دونوں ہیں!!!''
''پھر بھی وہ آپ کے درد کو نہیں سمجھتا۔۔کیا ان کی بیوی ٹھیک نہیں ہے؟؟؟''
''اپنے چراغ سے ہاتھ جل جائیں تو اس میں اوروں کا کیا قصور۔ میں نے اپنی ساری زندگی تگ ودو میں لگا دی۔۔۔۔شاید میری پرورش میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہو!!!''
چاچاجی کی بات سن کر ہمیں بہت دکھ ہوا۔۔۔۔ہم نے انہیں پیسے دیئے اور پلیٹ میں کھانا بھی لے آئے۔ پہلے تو کھانے کے لئے انکار کیا پر ہمارے بہت اسرار کرنے پر کھانا کھایا اور ہمیں ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔
ہمارے گھر والوں نے بھی ساری باتیں سنیں۔۔۔انھیں بھی بہت افسوس ہوا۔ سب نے ہی ایسی اولاد کو برا بھلا کہا۔
آج ہمیں اپنی سہیلی کے گھر جانا تھا اسلئے جلدی جلدی سارے کام نپٹا دیے۔ کھانا بھی تیار کر کے رکھ دیا تا کہ ہمارے پیچھے کوئی پریشانی نا ہو۔ جلدی سے تیار ہو کر باہر نکلے تو تیز دھوپ تھی۔ ایک منٹ بھی کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم نے کیب بک کی تھی جو وقت پر پہنچ گئی۔ شمع نے جو ایڈریس دیا تھا اس مطابق ہمارے گھر سے ان کا گھر کافی دور تھا۔ کیب میں بیٹھے۔۔۔کار کے شیشے اوپر چڑھا دیئے۔ اے سی کار راستے پر دوڑتی ہوئی ہماری منزل تک جا پہنچی۔ پتہ ڈھونڈنا اب کوئی مشکل کام نہیں رہا ہے۔۔۔بس جی پی ایس لگا دو اپنے آپ راستہ مل جاتا ہے۔ چھوٹا سا بنگلہ نما گھر تھا اور اسی سے لگ کر ایک باہر کی طرف چھوٹا سا روم بنا ہوا تھا۔ شاید سرونٹ کوارٹر ہو۔ ہم نے ڈور بیل بجائی تو ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ شاید شمع کے شوہر تھے۔ ہم نے سلام کیا اور شمع کو پوچھا۔
''جی اندر آجائیں۔۔۔۔شمع اندر ہے!!!!''
''ہم زویا ہیں!!!''
''جی! میں شمع کا شوہر شاہد ہوں!!!'' ہم بیٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ شمع ہاتھ میں پانی کا گلاس لے کر باہر آئی۔۔۔۔
''آو! آو! آو! زویا۔ ویل کم ٹو مائی ہوم!!!''
ہم دونوں وہیں صوفے پر بیٹھے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ شاہد اندر روم میں چلے گئے اور بچے بھی اندر ہی تھے!!!
''کیا کرتے ہیں شمع آپ کے شوہر؟؟؟؟'' ''ان کا اپنا کنسٹرکشن کا بزنس ہے۔۔۔اس لئے تو اتنا اچھا گھر بنا پائے۔''
''اچھا انہوں نے خود بنایا۔۔۔۔آپ کے ساس سسر کا کوئی گھر نہیں تھا۔''
''یہ ان لوگوں کا ہی گھر تھا۔ اس کو واپس نئے طریقے سے بنایا ہے۔''
''ماشااللہ! انجانے اس وقت اتنی بڑی جگہ کیسے لی ہوگی!!!''
''اب گھر پر بھی آپ کا نام ہے، شمع منزل۔''
''جی زویا! گھر میرے شوہر کے نام پر ہے تو انہوں نے گھر پر میرا نام ڈالا!!!''
''اور آپکے سسر کہاں رہتے ہیں؟؟؟'' "وہ۔۔۔وہ دبئی میں ہیں!!!!''
''ماشاءاللہ سب کچھ اچھا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے۔۔۔۔آپ کے بیٹے کیا کر رہے ہیں؟''
''وہ ابھی انجینئرنگ کر رہا ہے۔ آخری سال ہے۔ بیٹی بی ایڈ کر رہی ہے۔''
''زویا! تمارے بچے کیا کرتے ہیں؟''
''ہمارے بیٹے ڈاکٹر ہیں۔ بیٹی نے ایم اے کیا ہے۔ وہ جاب کرتی ہیں۔ ان شاءاللہ اب چار پانچ ماہ بعد شادی ہے دونوں بچوں کی!!!''
اتنے میں خادمہ نے آکر اطلاع دی کہ کھانا لگ چکا ہے اور ہم ڈائننگ روم کی جانب چل پڑے۔ سبھی نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی بہت ہنسی مذاق بھی ہو رہی تھی۔ ہم نے ان کے بچوں کو بتایا ہم دونوں بہت ہی اچھے دوست تھے پر شادی کے بعد ایسے بچھڑے کہ اب جا کر ملے۔۔۔۔شکر ہے رب کا اس نے ملا تو دیا!! شمع نے جذباتی انداز

میں کہا کہ زویا کئی سال کا وقفہ بیت گیا پر اب ہم کبھی جدا نہیں ہونگے !!!
انشاء اللہ شمع !!

کافی وقت ہو چکا تو ہم نے اجازت مانگی۔ شمع کو مع فیملی گھر آنے کی دعوت دی۔ ہم نے شمع کو گلے لگایا۔ بچوں کو پیار کیا اور شاہد بھائی کو اللہ حافظ کہہ کر باہر نکلے۔

ٹیکسی بک کر لی تھی مگر پتہ نہیں کیوں وہ اب تک پہنچی نہیں تھی۔ ہم وہیں کھڑے باتیں کرنے لگے کہ اچانک سرونٹ کوارٹر کا دروازہ کھلا۔ باہر آنے والے شخص کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ وہی تکیہ کو روالے چاچا جی تھے۔ ان کی نظر ہمارے اوپر پڑی تو وہ بھی خوش نظر آنے لگے۔ ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا، ''چاچا جی آپ یہاں ؟؟؟''

اچانک جیسے ان کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ بڑی مشکل سے ان کی آواز نکلی اور کہا، ''ہاں بیٹی میں یہیں رہتا ہوں۔'' تھوڑا رک کر مجھ سے وہاں آنے کی وجہ پوچھی۔''

جی چاچا جی۔ آپ نے تو بتایا نہیں تھا کہ آپ یہاں بھی کام کرتے ہیں۔ یہ ہماری سہیلی کا گھر ہے جنہوں نے آپ کو رہنے کے لئے یہ روم دیا ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔'' اور وہ تڑپ کر رہ گئے۔۔۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ چاچا جی؟ ہم نے کچھ غلط کہہ دیا ہے کیا؟''

''نہیں بیٹی! کچھ نہیں اپنے ہی غلط ہو جائیں تو کوئی کیا کرے۔۔۔ بس اب اس درد کو بہہ جانے دو۔ یہ آنسو نہیں یہ میرے دل کے زخم ہیں۔۔۔ جو ناسور بنے ہوئے تھے۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں سے خون بہہ رہا ہو۔''

''بتائیں کیا بات ہے؟ شاید ہم آپ کے لئے کچھ کر سکیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی۔''

ایک سرد آہ بھر کر شدت غم سے لرزتی ہوئی آواز میں بولے،'' بیٹی کبھی یہ میرا گھر تھا۔۔۔ جسے میری بیوی اور میں نے سنجویا تھا۔ جو اب میرے بیٹے کا ہے۔ بہو کوئی بوجھ نہیں چاہتی۔۔۔ اس لیے میں خود کماتا ہوں۔۔۔ خود پکا کر کھاتا ہوں اور اس کمرے میں رہتا ہوں۔''

یہ انکشاف ایک دھماکہ تھا جس نے میرے وجود کو لخت لخت کر دیا اور مجھے ریلنگ کا سہارا لینا پڑا۔ ایسا لگا کہ دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو شمع اندر جا چکی تھی۔ چاچا جی نے لڑکھڑاتی زبان میں اور کچھ باتیں بتائیں۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں بھی نہ تھی۔

اتنے میں ٹیکسی ہمارے پاس آ رکی۔ ٹیکسی کی آواز سن کر شاہد بھائی باہر آئے۔ شاید شمع نے بدلتے حالات کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ چاچا جی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر وہ بھی ٹھٹھک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے ہم نے کہا کہ ذرا شمع کو باہر بلائیں۔ کئی بار آوازیں دینے کے بعد شمع باہر آئیں۔ ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ان کے بچے بھی باہر آ گئے۔ ہمارے اندر کا غصہ ابل پڑا۔

''شاہد بھائی! آج معلوم پڑا کہ یہ آپ کے والد ہیں۔ شمع! تمہارے سسر سے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں اور بچو! یہ جو تمہارے دادا ہیں نا انتہائی تیز دھوپ میں کافی دور دور کے علاقے میں گلی گلی گھوم کر چھوٹے چھوٹے سامان بیچ کر پچیس پچاس روپے کماتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت پوچھا مگر کبھی اصل بات نہیں بتائی۔ آج خود بخود معاملہ سامنے آ گیا۔ شاہد بھائی! جس باپ نے اتنا کما کر، بنا کر آپ کو دیا، اس کا اچھا صلہ دیا آپ نے۔ شمع! آپ ہی ہمیشہ کہتی تھیں نا کہ مکافات عمل سے بچنا ہو تو زندگی میں کبھی بھی خیر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔ آپ اتنی سنگ دل کیسے ہو سکتی ہیں۔۔۔ واہ۔۔۔ اپنی تعلیم پر اچھا عمل کیا آپ نے۔ اور آپ بھول جاؤ مگر وقت کی چکی کا انتظار کرنا۔ آپ لوگوں کو کیا لگتا ہے کہ آپ اپنے بڑوں کو در در کی ٹھوکر کھلا کر خود چین سے اپنی موت کو پالو گے۔ آپ سب نے اپنا کام کر لیا۔ دکھی دل اپنا درد بہا چکا۔ اب ہم جیسے آپ لوگوں کا تماشہ دیکھیں گے اور وہ تماشہ دیکھنے کا وقت بہت جلد آئے گا۔ جو کیا ہے وہ بھرنا تو پڑے گا۔ جو آپ نے کیا ہے وہ آپ کے بچوں نے دیکھ لیا ہے۔ کاش شمع آپ ہمیں کبھی ملی ہی نا ہوتیں ہمارا بھرم تو قائم رہتا۔ اور ہم تیزی سے مڑے۔

آیئے چاچا جی! آپ کی یہ بیٹی آپ کو بلا رہی ہے۔''

ٹیکسی کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے ہم نے شمع اور شاہد بھائی کے چہروں کو پیلا پڑتے اور بچوں کے چہروں کو غصے سے لال ہوتے دیکھا۔ جب میں نے اپنے بازو میں بیٹھے چاچا جی کو دیکھا تو ان کے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔۔۔ او ہو میرے اللہ۔۔۔۔۔

Syed Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon-400104 (W) Mumbai

مراٹھی کہانی: مدھوکر دھرما پوری کر
ترجمہ: ضیاء الحسن

مجازی خدا

اعظم کی بیوی نے صبح صبح ایک وحشت ناک خواب دیکھا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی نیند پوری طرح اُڑ چکی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی اور دُنیا میں ہے۔ خواب کا اثر آہستہ آہستہ کم ہوا تو وہ ذرا سنبھلی۔ ساس بھی نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔ البتہ اُس کے چاروں بچے فرش پر بے ترتیب پڑے تھے۔ نحیف اور لاغر بچے، ان میں سے ایک کی ادھ کھلی آنکھ کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی وحشت اور بڑھ رہی تھی۔

بیوی بچوں کو اپنے والدین کے گھر چھوڑ کر اعظم نہیں معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ سے اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ ساس اور خسر بار بار دریافت کرتے تو بہو چڑھ کر کہتی۔ ''ٹریزری آفس بولے تو وہاں حساب کتاب کے کاماں رہتے۔ رات رات بھر وہ گھر واپس نہیں آتے تھے''۔

پھر وہ انہیں ساری تفصیلات بتلاتی کہ جس شہر میں اعظم کی ملازمت ہے وہاں انھیں کئی مسائل کا سامنا تھا۔ آفس کی مصروفیات کی وجہ سے اعظم بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً انہیں یہاں آنا پڑا۔ لیکن اعظم کے باپ نے بہو کی ان باتوں سے کبھی بھی اتفاق نہیں کیا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔ ''لوگاں (لوگ) نوکری ئیں کرتے کیا؟'' کیا اِسکو اچ ساری دُنیا کا کام ہے؟ کون سا طرم خان ہے وہ؟ پوچھتا تو بولتا بھی ئیں۔ . . گالی . . . ''۔

''بچوں کو اسکول میں کب شریک کرائیں گے؟ ابھی تک داخلہ نہیں ہوا''۔ ساس شکایت کرتی تو وہ اسے یوں مطمئن کرتی۔ ''کاغذات لانا پڑتا نا داخلے کے واسطے' اُن کو فرصت ملی تو لائیں گے''۔ اپنے شوہر کا دفاع کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکتی تھی۔ ''پیسوں کے کاماں ہیں اُن کے' ذمہ داری کی نوکری ہے' کبھی کبھی تو ہزاروں روپے میرے حوالے کردیتے تھے اُنوں' بہت جوکھم رہتا اُن کو''۔

ویسے اعظم کے باپ کو اپنے بیٹے کے معاملات کی سُن گن بہت پہلے لگ چکی تھی۔

''ذمہ داری؟ کاہے کی ذمہ داری! مٹکا کھیلنے ٹائم ملتا' شراب کی بو آتی ہے بدمعاش کے منہ سے''۔ وہ بڑبڑاتا ہوا گھر سے نکلتا۔

اعظم کی بیوی صحن میں بیٹھی جوار چُن رہی تھی۔ کام کے دوران بھی پرانے گھر سے جڑی یادیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ اعظم کی پیار بھری باتیں' بچوں سے اس کا لاڈ پیار کرنا' سب کچھ اُسے یاد آنے لگتا۔ لیکن کئی دنوں سے وہ ادھر پھٹکا بھی نہیں تھا۔ گھر کے اخراجات کے لئے آخری بار جب اُس نے پیسے مانگے تھے تو اعظم نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادی تھی۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر وہ اکثر پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ ایک بار اُس نے اپنے لئے سو روپے کی چوڑیاں خریدی تھیں تو اعظم بہت ناراض ہوا تھا۔

سر نیوڑھائے وہ جوار چُننے میں مصروف تھی۔

''آئے نہیں کیا اعظم میاں . . . . ؟ مخدوم کی ماں کی آواز سن کر وہ چونک پڑی اپنے شوہر کے بارے میں چل رہی ایسی ویسی باتیں اِسے ہمیشہ ناگوار گذرتیں۔ لیکن مخدوم کی ماں تو آج ایک نئی خبر لے کر وارد ہوئی تھیں۔ پہلے تو بڑی بی نے ساس اور بہو کے چہروں کا بغور جائزہ لیا پھر تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔

اُنوں (وہ) کہہ رہے تھے کہ اعظم میاں نائے گاؤں کے بس اسٹینڈ پر دکھائی دیئے''

''کس کو دکھائی دیئے؟'' اعظم کی ماں نے تجسس کے ساتھ دریافت کیا۔ بہو بھی فوراً اس طرف متوجہ ہوگئی۔

''اُن کا دوست سلطان بول رہا تھا''۔

''گئے ہوں گے وہاں اُن کے سرکاری کام رہتے''۔ اعظم کی بیوی بجلی کی طرح کڑکی۔

اطراف میں بکھرا ہوا دانہ دنکا چگ رہی مرغی اور چوزے بدک کر دور ہٹ گئے۔

اعظم کے تعلق سے گاؤں میں طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا گذشتہ ایک مہینے سے وہ آفس سے غیر حاضر ہے' تو کوئی کہتا اُس نے طویل رخصت لے رکھی ہے۔ اُس کے نام نوٹس جاری ہونے کی اطلاع بھی آئی تھی۔ لیکن اعظم کے باپ کو کل کسی نے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے نے پیسوں کا بہت بڑا گھپلا کیا ہے۔ اس اطلاع پر بہو بری طرح بپھر گئی تھی۔

''گھپلا؟ کیوں کریں گے وہ گھپلا؟ وہ چور ہیں کیا؟ ذمہ داری کی نوکری ہے اُن کی' پھوٹی کوڑی بھی نہیں مانگتے ہم کسی سے' ہم کسی کے شرمندہ نئیں' اوپر والا سب کو اچ دیکھ رہا ہے۔ جلنے والے ایسے بہت رہتے''۔

بہو کے تیکھے تیور دیکھ کر آج اس موضوع پر فل اسٹاپ لگ گیا تھا۔

البتہ چھوٹے موٹے جرائم کے بارے میں باتیں برابر ہو رہی تھیں۔ باتوں باتوں میں مخدوم کے ایک رشتہ دار کا ذکر آیا جسے کچھ دن پہلے پولس پکڑ کر لے گئی تھی۔ مسلسل چار دنوں تک حوالات میں رکھ کر اُسے اتنا مارا پیٹا گیا کہ بے چارے کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ پولس والوں کی مٹھی گرم کرنے کے بعد ہی اُسے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ بہر حال روزانہ اس قسم کے واقعات کے تذکرے اعظم کی بیوی کے لئے سوہانِ روح بنتے جا رہے تھے۔

اس پر صبح کا وحشت ناک خواب اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر رہا تھا بکھری ہوئی جوار سمیٹتے ہوئے وہ مخدوم کی ماں سے اونچی آواز میں مخاطب ہوئی۔ ''دیکھو خالہ! جو کوئی بُرا کام کرتا نا اُسے ڈر رہتا ہے' اچھے کام کرنے والوں کو اللہ دیکھتے' پھر کیوں ڈرنا کسی سے؟''

''ہمارا اعظم ویسا نہیں ہے جی' بہت سیدھا سادہ ہے وہ'' . . .

ماں اپنے بیٹے کی شرافت کا قصیدہ پڑھنے لگی۔ اپنی پوزیشن متاثر ہوتی دیکھ کر مخدوم کی ماں نے فوراً پینترا بدلا۔ ''میں کب بول رہی ہوں ایسا ویسا' اُن کو معلوم نئیں کیا اعظم میاں کیسے ہیں! ہماری رخسانہ کی شادی میں آئے تھے نا' بہت شریف آدمی ہیں وہ . . .''

ہمیشہ کی طرح آج بھی اعظم کے گھر کے معمولات میں سست روی دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ اس کی بیوی تیزی سے اپنے کام نپٹ رہی تھی۔

سبز رنگ کے بستے اپنے نازک کندھے سے لٹکائے دو بچے اسکول جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ چھوٹے دو کھیل کود میں مصروف تھے۔ بچے کسی چیز کے لئے ضد کرتے تو اعظم کی بیوی انہیں سمجھاتی۔ ''ابا آنے کے بعد اپن وہ چیز لائیں گے۔''

شام ہوتے ہی چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ ''امّی امّی ابا آئے' ابا آئے۔'' بچے یکایک خوشی سے چلانے لگے۔ جوار کی روٹیاں بناتے بناتے اعظم کی بیوی جلدی سے اُٹھی اور ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے باورچی خانے سے باہر آئی۔

بچوں کو لاڈ پیار اور کبھی کبھی اپنی بیوی کو گالیوں سے نوازنے والا اعظم' جو دور رہ کر بھی ہمیشہ اس کے وجود پر چھایا رہتا تھا' سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے اُسے تکے جا رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ دھوئے۔ ادھر بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ باپ کے اطراف منڈلا رہے تھے۔ اعظم نے ایک کیری بیگ میں سے ڈبل روٹیاں اور ٹوسٹ نکالے اور بچوں میں تقسیم کرنے لگا۔ پھر اس نے حسبِ عادت قمیص کی آستین اوپر چڑھائی' کلائی پر بندھی گھڑی کو پیچھے کی طرف سرکایا اور صحن میں بنے ایک چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''کب آیا؟'' بوڑھی ماں نے شفقت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

''ابھی اچ آیا''

اعظم کی بیوی نے ایک بچّی کو چائے کی پتی لانے کے لئے دوکان کی طرف دوڑایا۔ ''میں ابھی چائے بناتی ہوں' سالن بناؤں کیا گوشت کا'' ۔۔۔قریب آ کر بیوی نے اعظم سے پوچھا لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''مخدوم بول رہا تھا کہ تو دفتر کو نہیں جا رہا ہے۔'' ماں کے لہجے میں شکایت تھی۔

''اُس کمینے کو کون بولا تھا وہاں جانے'' اعظم آگ بگولہ ہو گیا۔

''نہیں! میں اچ بولی تھی' پندرہ بیس دن ہو گئے تو آیا ئیں نا''

''ارے وہ مخدوم کو کیا کرنا ہے۔ اپنا اپنا دھندہ پانی سنبھال بولنا''۔

اتنے میں بیوی چائے لے کر آئی۔ ''میں تو اِن کو بولی تھی کسی کو بھی نکّو (مت) بھیجو' کاماں رہتے' دورے رہتے تمہارے ۔۔۔۔''۔

بیوی کی بات کاٹتے ہوئے اعظم نے پوچھا۔ ''ارے! وہ گلسر (گلے کا زیور) کہاں ہے؟'

انو چ بولے تھے صندوق میں رکھ دے' چوری کا ڈر رہتا''۔ ساس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی۔

''ہاں! میں اچ بولی تھی' کیا کرنے کا اتا بھاری چار تولے کا زیور''۔ ساس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

تھکا ماندہ اعظم متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ بچّے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

کھیلتے کھیلتے وہ باپ کے کندھے پر سوار ہو جاتے۔

''چپ رہو' چپ رہو'' وہ انہیں منع کرتا۔

بوڑھا باپ ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اعظم کی ماں نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں کیا رے اعظم''۔ ماں کے پوچھنے پر وہ چڑ گیا۔

''طبیعت کو کیا ہوا؟''

اتنے میں اچانک بجلی چلی گئی۔ اعظم کا باپ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور بوتل سے بنا ہوا چراغ لے آیا۔

اعظم کی بیوی بچوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے ان کا دل بہلا رہی تھی لیکن اُس کی ساری توجہ شوہر کی طرف تھی۔ وہ تذبذب میں تھی کہ گفتگو کا آغاز کس طرح کرے۔

''مخدوم کی ماں کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ بینڈ باجے کے شور کی وجہ سے اُسے خاموش ہو جانا پڑا۔ کوئی بارات گذر رہی تھی۔ بچے دروازے کی طرف دوڑے۔

سجے دھجے گھوڑے پر سوار دولہے کا چہرہ سہرے میں چھپا ہوا تھا۔ کئی مزدور بانس پر بندھے ہوئے ٹیوب لائٹس ہاتھوں میں تھامے بارات کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

ٹیوب لائٹ کی روشنی اعظم کے افرادِ خانہ پر پڑتی تو وہ ایک لمحے کے لئے روشنی میں نہا جاتے' دوسرے ہی لمحے اُن پر اندھیرا چھا جاتا۔ اتنا شور تھا کہ کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''رحمٰن سیٹھ کے بیٹے کی شادی ہے''۔ بوڑھی ماں کی آواز شور میں گم ہو گئی۔

مخدوم کے رشتہ دار کو حوالات میں زدوکوب کئے جانے کا قصہ اپنے شوہر کو سنانے کے لئے اعظم کی بیوی بے قرار تھی۔ لیکن اسے مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔ اُس نے اپنے خسر کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے ناراضگی جھلک رہی تھی۔ ویسے بھی باپ بیٹے میں بات چیت بہت کم ہوتی تھی۔ اعظم کی سرگرمیوں کو وہ ہمیشہ ہی مشکوک نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔

اعظم کی نگاہیں بارات پر جمی ہوئی تھیں۔ شوروغل ذرا کم ہوا تو وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔

''مخدوم کی ماں کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔'' اعظم نے آگ بگولہ ہو کر اُسے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

''تو' کیوں مری تھی وہاں''۔ مار سے بچنے کی کوشش میں اُس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ''میں نئیں گئی تھی وہاں۔۔'' وہ گھبرا کر بولی

''ارے! مخدوم کی ماں اپنے گھر آئی تھی''۔ ساس نے بیٹے کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

بہو کے گال پر اُنگلیوں کے نشان اُبھر آئے تھے۔ فرش پر پڑی ہوئی پیالی' طشتری اُس نے اُٹھائی۔ چوڑیوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اکھٹا کیئے اور اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اعظم بھی کمرے میں چلا آیا اور بچوں کی کوئی کتاب لے کر بیٹھ گیا۔

آدھی رات کے قریب کمرے سے گالی گلوچ کی آوازیں آنے لگیں تو بوڑھے باپ کی آنکھ کھل گئی۔ دادا کے پہلو میں سو رہی ننھی پوتی بھی سہم کر اُٹھ بیٹھی۔ فحش گالیاں دیتے ہوئے اعظم اپنی بیوی کو بے تحاشا مار رہا تھا۔

''مت مار بولنا بدمعاش کو'' ۔۔۔۔ شوہر کے کہنے پر اعظم کی ماں اٹھی اور بند دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ بیٹے کا ہاتھ چل رہا تھا تو بہو کی زبان۔ کچھ دیر بعد کمرے سے آوازیں آنا بند ہو گئیں تو بڑی بی نے اطمینان کا سانس لیا اور بستر پر جا لیٹیں۔

دوسرے دن اعظم کا باپ منہ اندھیرے ہی کہیں نکل پڑا تھا۔ صبح ہوئی تو اعظم بھی بستر سے اُٹھا۔ باہر آ کر گلی کی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی چائے سے لبالب بھرا ایک کپ لے کر آئی۔ وہ گردن جھکائے چائے پینے لگا۔

''جا رہے ہو کیا ڈیوٹی پر'' ۔۔۔۔ بیوی نے اس کی طرف ایک ٹوسٹ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

لیکن اعظم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے ایک نظر شوہر پر ڈالی اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آنے تک اعظم دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''جاتوں'' (جا رہا ہوں)۔ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

''اجی دیکھو...'' بیوی نے اُسے آواز دی۔ وہ پلٹا۔

''یہ گلسر رکھو'' اعظم کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ بولی ''مجھے کیا کرنے کا' تمہارے خرچے پانی کے کام آئے گی' گھر میں رکھنا بھی تو خطرے سے خالی نئیں ہے نا''۔

اُس کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھنے لگی۔ نا اُمیدی اور مایوسی کے بادلوں میں سے اُسے اُمید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔

□□□

Dr. Ziaul Hasan
Lane -15, HZT Peer Burhan Chowk,
Nanded- 431605 (MS)

سرخاب فاطمہ

رونق جمال

انور کی شادی کو تقریباً دو سال گزر چکے تھے اور اس کے یہاں پہلے بچے کی آمد کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ شرین سرشار ہو کر انور سے پوچھتی کہ 'آپ کو کیا چاہیے بیٹا یا بیٹی!!؟' انور تپاک سے جواب دیتا' بیٹی۔ لیکن اگر بیٹا بھی ہو گیا تو کوئی بات نہیں۔ اگلی بار بیٹی آجائے گی۔' اور آج شرین نے پہلے بچے کی شکل میں بیٹی کو جنم دیا تھا۔ انور خوشی سے جھوم رہا تھا۔ رشتے داروں اور دوستوں کو فون کر کے خوبصورت بیٹی کا باپ بننے کی خبر سنا کر فخر محسوس کر رہا تھا دواخانے کے اسٹاف کو اس نے بیٹی پر سے نچھاور کر کے پانچ ہزار روپے بانٹ دیے تھے۔ مٹھائی الگ سے کھلائی تھی۔ انور کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سارے شہر کو مٹھائی کھلاتا پھرتا۔ انور خوشی خوشی گھر پہنچا اور ایک موتی چور کا لڈو دادی کو دیتے ہوئے بولا۔

'یہ لو دادی لڈو کھاؤ...... میں باپ بن گیا ہوں اور آپ پردادی۔! میں بیٹی کا باپ بن گیا ہوں...... انشاء اللہ اب اس گھر میں رونقیں ہی رونقیں ہوگی۔'

'انور تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔؟ بیٹی کے پیدا ہونے پر کوئی ایسی خوشیاں مناتا ہے کیا۔!!'

'آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں دادی؟ بیٹی کی پیدائش کی خوشیاں ایسی ہی منانی چاہیے۔ بیٹی اللہ کا انعام ہوتی ہے...... پتا ہے آپ کو۔!! اللہ جب بہت خوش ہوتا ہے نا تو بیٹی کو دنیا میں بھیجتا ہے اور ہمارے آقا جناب حضرت محمد ﷺ کو بھی بیٹیاں عزیز تھیں۔ آپ نے فرمایا جس نے بیٹیوں کی پرورش بخیر وخوبی سے کی۔ اللہ بیٹیوں کے باپ کو جنت عطا کرے گا۔ اور تو اور دادی آج کل بیٹیاں ہی کام آتی ہیں...... بیٹے تو جوان ہو کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں...... آپ کے تین بیٹے ہیں...... میرے ابو کو اللہ نے اٹھا لیا...... ابو کے انتقال کے بعد آپ کو مجھے اماں کو سہارا کس نے دیا۔؟ بلقیس پھوپی نے نا۔ تایا ابو اور چچا نے تو آپ کو در در بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ بلقیس پھوپی نہ ہوتی تو ہمارا کیا انجام ہوتا دادی۔؟ اور دادی آپ بھی تو ایک بیٹی ہو۔ پھر آپ کو بیٹی کی پیدائش پر خوشی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ دادی بیٹیاں نیک ہوتی ہیں...... صرف اُن کی پرورش اچھی طرح کرنی چاہیے۔ ان کو پورا پورا موقع دینا چاہیے۔ بیٹے وقت آنے پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں...... اب زمانہ بدل گیا ہے دادی...... بیٹیاں ہر میدان میں بیٹوں سے آگے ہیں...... بیٹے تو اولڈ ایج ہوم آباد کرنے میں مصروف ہیں۔'

'انور تو نے میری آنکھیں کھول دی ہیں بیٹا۔ تو تو واقعی بڑا اور سمجھدار ہو گیا...... لا مجھے لڈو کھلا اور یہ لے ان سارے روپیوں کے لڈو محلے بھر کو کھلا دے اور مجھے دواخانے لے کر چل...... مجھے پوتی کو دیکھنا ہے...... اس کا نام تجویز کرنا ہے...... اسے پیار کرنا ہے...... اسے ہاتھوں میں اٹھا کر...... اللہ کا شکر ادا کرنا ہے...... چل بیٹا جلدی کر......!! میں نے پوتی کا نام بھی سوچ لیا ہے۔'

'کیا نام سوچا ہے دادی—؟'

'سرخاب فاطمہ!'

'واہ...... دادی...... سبحان اللہ...... اللہ مبارک کرے!!'

Raunaq Jamal
'Kainat" Street No. 9
Adarsh Nagar
Durg-491001 (Chhattisgarh)

ڈاکٹر شبنم عشائی

نظم

نئے Pack میں

کن ذائقوں کو چن رہے ہو
کن چہروں کو تلاش رہے ہو
گھر کا چہرہ بدل گیا ہے
محبت کا من بدل گیا ہے
دسترخواں اُداس پھیلا ہوا ہے
پاپا کا کوئی حکم نہیں ہے
خاموشیاں ماں کی کہیں نہیں ہیں
دادا نہیں ہے دستار نہیں ہے
دادی نہیں ہے شب دیگ نہیں ہے
قاب کا سرپوش اٹھانے والا خادم نہیں ہے
اپنی اپنی آرام گاہ میں سب محفوظ ہیں
سرہانے سب کے تمام مسرتیں بہم ہیں

بشریٰ ہاشمی

غزل

آنکھوں کو اب نگاہ کی عادت نہیں رہی
اب کچھ بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی

سچائیوں کی راہ بہت ہو گئی کٹھن
اس راستے پہ چلنے کی ہمت نہیں رہی

دشمن ہو دوست ہو کوئی اپنا کہ غیر ہو
ہم کو تو اب کسی کی بھی حاجت نہیں رہی

دنیا عزیز تر رہی اک عرصۂ دراز
لیکن اب اس کی بھی تو محبت نہیں رہی

عرصہ ہوا کسی نے پکارا نہیں مجھے
شاید کسی کو میری ضرورت نہیں رہی

کانٹا سا ایک دل میں کھٹکتا ہے مستقل
پر دل کی بات کہنے کی عادت نہیں رہی

سرمایۂ حیات ہوا چاہتا ہے ختم
جس پر غرور تھا وہی دولت نہیں رہی

بشریٰ کبھی جو جاؤ وہاں عرض حال کو
کہنا کہ ہم پہ اب وہ عنایت نہیں رہی

محمد ارشاد (ہوڑہ)

نظم

عبرت زمانہ

کانچ کے دو ٹکڑوں نے
کیا نہیں یہاں دیکھا
دوگھائیں ایسی ہیں
جن نے سب ہے سن رکھا

وہ بڑائی کے نعرے
وہ خدائی کے دعوے
وہ عروج شاہانہ

خاک اوڑھتی پلکیں
دھوپ چاٹتے ابرو
رہ گئے سبھی خاکے
مٹ گئے سبھی نقشے

شیوہ تھا، جنوں کا زعم
پادشاہی فطرت تھی

آج بھی صدا ان کی
دفن ہے ہواؤں میں
عبرت زمانہ کو
نام ان کے کافی ہیں

صدف اقبال

غزل

یہ راتوں کا اتر آنا، جگانا بھی سلانا بھی
کبھی اس کا منا لینا، کبھی خود روٹھ جانا بھی

ہمیں محسوس ہوتا تھا، کہ ہے اک تجربہ اچھا
کسی کی آنکھ کی گہرائیوں میں ڈوب جانا بھی

تمہارا یوں بتا دینا کہ بس کل گاؤں جاؤں گی
مرا افسردہ ہوجانا، مگر آنسو چھپانا بھی

عجب سا ایک جذبہ، جو مرے اندر ابھرتا تھا
نظر انداز کر دینا اسے، اور مسکرانا بھی

کبھی مغموم ہو جاؤں، تو سینے سے لگا لینا
کبھی اغیار کی باتیں بتا کر آزمانا بھی

مری پیاری سکھی اک بار مل لو، جی بہل جائے
صدف سب یاد ہے مجھکو، وہ ہنس ہنس کر ستانا بھی

Sadaf Iqbal
Post. Bhadeya
PS. Barachatti, Via- Dobhi
Distt. Gaya-824220 (Bihar)

بیگم لکھنوی

غزل

برسوں غم گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا

کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا

وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اس کا
سر ہم نے تہہ خنجر خوں خوار تو رکھا

اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگمؔ
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا

اندرا ورما

غزل

ابھی سے کیسے کہوں تم کو بے وفا صاحب
ابھی تو اپنے سفر کی ہے ابتدا صاحب

نہ جانے کتنے لقب دے رہا ہے دل تم کو
حضور، جانِ وفا اور ہم نوا صاحب

تمہاری یاد میں تارے شمار کرتی ہوں
نہ جانے ختم کہاں ہو یہ سلسلہ صاحب

کتاب زیست کا عنوان بن گئے ہو تم
ہمارے پیار کی دیکھو یہ انتہا صاحب

تمہارا چہرہ مرے عکس سے ابھرتا ہے
نہ جانے کون بدلتا ہے آئینہ صاحب

رہ وفا میں ذرا احتیاط لازم ہے
ہر ایک گام پہ ہوتا ہے حادثہ صاحب

سیاہ رات ہے مہتاب بن کے آ جاؤ
یہ اندراؔ کے لبوں پر ہے التجا صاحب

انڈوں کے پکوڑے

اجزا: انڈے چھ عدد (سخت ابلے ہوئے چھیل لیں اور آدھ انچ موٹے قتلے کاٹ لیں)، بیسن بی بی آدھا کپ، کارن فلور دو چائے کے چمچ، سفید مرچ حسب ضرورت (پسی ہوئی)، نمک حسب ضرورت، اجینو موتو چٹکی بھر، سویا ساس ایک چائے کا چمچ، چلی گارلک ساس دو چائے کے چمچ

ترکیب: بیسن کارن فلور اور ساری اشیا پانی کے ساتھ پیسٹ بنا لیں جو زیادہ پتلا نہ ہو۔ اب انڈوں کو اس میں ڈبو کر بالکل مدھم آنچ پر تیل ڈال کر تلیں اس ترکیب سے آلو کے قتلے اور پیاز کے لچھے بھی فرائی کر سکتی ہیں۔

بیسن کی کھنڈویاں

اجزا: کھنڈویوں کے لئے:

بیسن (چھنا ہوا) 1/2، پیالی/ تازہ دودھ 1/2 پیالی، پسا ہوا لہسن ادرک ایک کھانے کا چمچہ، پسی ہوئی ہلدی۔ ایک چائے کا چمچہ، لیموں کا رس ایک کھانے کا چمچہ، ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) 1/2 گڈی، ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی) 3 عدد، پنیر (کدوش) ایک پیالی، پسا ہوا ناریل ایک پیالی، نمک حسب ذائقہ، تیل ایک پیالی

سالن کے لئے:

پسا ہوا ٹماٹر ایک پیالی، دہی (پھینٹی ہوئی) ایک پیالی، پسی ہوئی لال مرچ 1/2 کھانے کا چمچے، پسی ہوئی ہلدی ایک چائے کا چمچہ، پسا ہوا گرم مصالہ ایک چائے کا چمچہ، پسا ہوا زیرہ ایک چائے کا چمچہ، پسا ہوا لہسن

ادرک 2 کھانے کے کے چمچے، پیاز پسی ہوئی) ایک پیالی، نمک حسب ذائقہ، تیل 4 کھانے کے چمچے، ہرا دھنیا سجانے کے لئے

ترکیب: بیسن میں لہسن، ادرک ہلدی لیموں تیل دودھ اور نمک ملا لیں۔ آمیزے کو ہلکی آنچ پر گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اس میں ناریل ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ملا کر اتار لیں۔ ایک ٹرے کو چکنا کریں اور بیسن کا آمیزہ اس پر ڈال دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ سالن بنانے کے لئے دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کر لیں، پھر لہسن ڈال کر 2 منٹ تک بھونیں، اس میں باقی تمام اجزاء ڈال کر تیل اوپر آنے تک بھونیں، پھر کھنڈویاں شامل کر کے ملا لیں اور ڈش میں نکال دیں۔ مزیدار کھنڈویاں ہرے دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

مرغ چنے

اجزا: چکن۔ ایک کلو، سفید چنے (ابلے ہوئے) ایک پیالی، ادرک لہسن پسا ہوا دو کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، پیاز (باریک کٹی ہوئی) دو عدد درمیانی، ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے) تین عدد درمیانے، کالی مرچ پسی ہوئی۔ ایک کھانے کا چمچ، دھنیا پسا ہوا ایک کھانے کا چمچ، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، ہلدی پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، بناسپتی گھی آدھی پیالی

ترکیب: دیگچی میں بناسپتی گھی کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ کے لیے ہلکا سا گرم کر کے پیاز سنہرا فرائی کر لیں۔ پھر ادرک، لہسن اور کالی مرچ ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں اور ٹماٹر ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ اچھی طرح گل جائیں۔ نمک، دھنیا، زیرہ، ہلدی اور چکن ڈال کر اتنی دیر بھونیں کہ بناسپتی علیحدہ سے نظر آنے لگے۔

چنے ڈال کر دو پیالی پانی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ تک پکائیں۔

پنجابی کڑھی

اجزا: دہی 1/2 2 کلو، چھاچ 1/2 2 لیٹر، بیسن 250 گرام، ہلدی 1 چائے کا چمچ، نمک 1 چائے کا چمچ، کٹی لال مرچ 1 کھانے کا چمچ، میتھی دانہ 1 کھانے کا چمچ

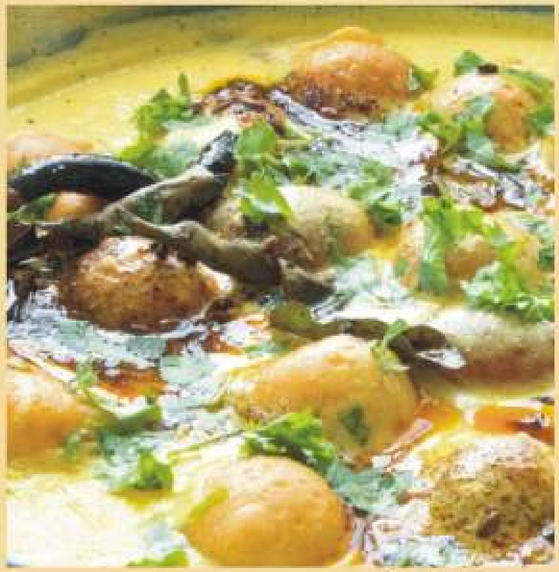

تڑکا لگانے کے اجزا:

لہسن کے جوے 6 عدد، گول مرچ 6 عدد، کڑھی پتے 6 عدد، تیل 1/2 کپ، زیرہ 1 چائے کا چمچ

پکوڑے بنانے کے اجزا:

بیسن 250 گرام، کٹی پیاز 1 عدد، زیرہ 1 چائے کا چمچ، پسی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، نمک 1/2 چائے کا چمچ، تیل حسب ضرورت

ترکیب:

1/2 کپ میں تیل گرم کر کے 1 کھانے کا چمچ میتھی دانہ ڈال دیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں ایک کھانے کا چمچ کٹی لال مرچ، ایک چائے چمچ ہلدی اور ایک چائے چمچ نمک ڈال کر بھونیں۔ پھر آدھا لیٹر چھاچ اور 250 گرام بیسن اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اور ڈش میں ڈال کر آدھے گھنٹے ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ اب پکوڑے بنانے کے لئے 250 گرام بیسن، ایک چائے چمچ زیرہ، ایک چائے پسی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ نمک اور ایک عدد کٹی پیاز کے پکوڑے بنا کر تیل میں تل لیں۔ جب کڑھی پک جائے تو اس میں بنائے ہوئے پکوڑے ڈالیں۔ آخر میں آدھا کپ تیل گرم کر کے 6 عدد لہسن کے جوے، 6 عدد گول مرچ، ایک چائے چمچ زیرہ اور 6 عدد کڑھی پتوں کو فرائی کریں اور کڑھی پر ڈال دیں۔

انصاری ترنم بانو زبیر احمد

بریسٹ کینسر

بریسٹ کینسر ایک ایسی رسولی ہے جو کہ چھاتی کے خلیات میں غیر معمولی زیادتی کی بنا پر بنتی ہے زیادہ تر بریسٹ کینسر کی شروعات ملک ڈکٹ سے ہوتی ہے۔دنیا بھر کی خواتین میں چھاتی کا کینسر (بریسٹ کینسر) عام ہوتا جارہا ہے۔عموماً بریسٹ کینسر کی نشانیاں/علامات جلدی ظاہر نہیں ہوتیں اس وجہ سے اکثر طویل عرصہ تک اس کی شناخت نہیں ہو پاتی ہے۔حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا کی کل آبادی میں 16 فیصد عورتوں کو بریسٹ کینسر کا عارضہ لاحق ہے۔کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ بیماری صرف 'دوسروں' کو ہوتی ہے؟ دنیا میں عورتوں کے ہونے والے کینسر میں اب بریسٹ کینسر سرفہرست ہے لیکن ہندوستان میں بیداری اور علاج کی راہ میں سفر ابھی لمبا ہے۔

ہندوستان میں کینسر کے کیسیز:

انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2012 میں دنیا بھر میں سولہ لاکھ ستر ہزار عورتیں بریسٹ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئیں۔ہندوستان میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ چوالس ہزار کینسر کی تشخیص ہوتی ہے۔کونسل کے مطابق مرض کے ابتدائی مراحل میں بھی بریسٹ کونزرویشن یا سرجری میں چھاتی بچانے کی شرح بہت کم ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ جدید ترین طبی سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ہندوستان کے دیہی علاقوں میں ہر ایک لاکھ میں سے صرف پانچ عورتیں بریسٹ کینسر کا شکار ہوتی ہیں لیکن شہری علاقوں میں تعداد 30 تک پہنچ جاتی ہے۔عالمی ادارہ صحت (ڈبلو ایچ او) کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں بریسٹ کینسر کے کیسیز بڑھ رہے ہیں کیونکہ وہاں اب اوسط عمر بڑھ رہی، لوگ شہروں میں رہ رہے ہیں اور مغربی طرز کی زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ڈبلو ایچ او کے مطابق 2011 میں دنیا بھر میں بریسٹ کینسر سے تقریباً پانچ لاکھ عورتوں کی موت ہوئی۔لیکن مختلف ممالک میں کینسر کی شرح میں کافی فرق ہے۔مشرقی افریقہ میں ایک لاکھ عورتوں میں سے تقریباً 19 کو بریسٹ کینسر ہوتا ہے لیکن مغربی یورپ میں یہ شرح 90 سے کچھ کم ہے۔ظاہر ہے کہ بریسٹ کینسر کے علاج اور بعد کی زندگی کے معیار کا تعلق براہ راست حفظان صحت کے نظام سے ہے۔ایک تحقیق کے مطابق بریسٹ کینسر کیوں ہوتا ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں دیر تک حیض جاری رہنا اور زیادہ عمر میں پہلے بچے کی پیدائش وغیرہ شامل ہیں یعنی بنیادی طور پر جسم میں ایسٹروجن ہارمون کی زیادتی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔لیکن جو مائیں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں وہ بریسٹ کینسر سے زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔

ماہرین کے مطابق کینسر کے زیادہ تر کینسر کو روکا تو نہیں جا سکتا لیکن اگر بیماری کا بروقت پتا چل جائے تو کینسر سے اموات کی شرح کو بہت کم اور باقی زندگی کے معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ تشخیص کا بہترین طریقہ تو میموگرافی ہے لیکن ماہرین کے مطابق عورتوں کو خود بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے بریسٹ میں کوئی گانٹھ تو محسوس نہیں ہو رہی، چھاتی کا سائز تو تبدیل نہیں ہو رہا، نپل انورٹڈ (inverted) (تو نہیں ہے یعنی اندر تو نہیں جا رہا، نپل سے کوئی مواد تو نہیں بہہ رہا، بغل میں سوجن یا گانٹھ تو نہیں ہے اور بریسٹ میں ایسا درد یا تکلیف تو نہیں جو ٹھیک نہ ہو رہا ہو۔ یہ بریسٹ کینسر کی علامات ہو سکتے ہیں۔ بریسٹ کینسر سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ خطرناک بیماری ضرور ہے لیکن اگر تشخیص وقت پر ہو جائے تو اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بس ضرورت آگاہی کی ہے۔

بریسٹ کینسر کے علاج میں نئی تحقیق کیا ہے؟

بریسٹ کینسر کے زیادہ تر مریضوں کو سرجری، کیموتھراپی، ریڈیو تھراپی اور ہارمون ریپلیسمنٹ تھراپی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیموتھراپی کینسر کے خلیات کو تباہ کرتی ہے لیکن اس کے کئی مضر اور خطرناک اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اب ایک غیر معمولی ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے مریضوں کو کیموتھراپی کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اس کے بغیر بھی ایک اچھی اور صحت مند زندگی گزار سکتی ہیں۔ لیکن اس زمرے میں بریسٹ کینسر کے سب مریض نہیں آتے یا ہر طرح کا بریسٹ کینسر نہیں آتا۔ اگر کچھ شرائط پوری ہوں اور مرض ابتدائی مراحل میں ہو، تو ایک ٹیسٹ ہے جو یہ بتا سکتا ہے کہ کیموتھراپی کی جانی چاہیے یا نہیں۔ اس ٹیسٹ کو آنکو ٹائپ ڈی ایکس

کہتے ہیں اور اس سے بنیادی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کینسر کے دوبارہ ہونے کے کیا امکانات ہیں یا کینسر کتنا اگریسو یا خطرناک ہے لیکن یہ بہت مہنگا ٹیسٹ ہے اور تقریباً تین لاکھ روپے میں ہوتا ہے۔ دوسری بڑی تحقیق ابھی آزمائش کے دور سے گزر رہی ہے۔ اس میں مریض کے جسم سے وہ خلیات حاصل کیے جاتے ہیں جو کینسر کے خلیات کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قدرتی مدافعتی نظام کا حصہ ہے۔ مدافعتی نظام کامیاب رہے تو مرض کنٹرول یا ختم ہو جاتا ہے۔ سائنسدانوں نے ان خلیات کو نکالا، لیب میں انہیں (گرو) افزائش کیا اور پھر واپس جسم میں ڈال دیا۔ امریکا کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ (این سی آئی) کے ماہرین نے بھی ایسا ہی کارنامہ کر دکھایا، جنہوں نے غیر معمولی تھراپی کے ذریعے بریسٹ کینسر کی آخری اسٹیج کی مریضہ کی زندگی کو بچایا۔ ماہرین نے ریاست فلوریڈا کی 52 سالہ جوڈی پارکنس، جس کا بریسٹ کینسر پورے جسم میں پھیل چکا تھا۔ جسم میں انجکشن کے ذریعے ایسے 90 ارب سفید خلیے ڈالے، جنہوں نے کینسر زدہ خلیات پر حملہ کر کے موذی مرض کا خاتمہ کیا۔ ماہرین نے جوڈی پارکنس کی تھراپی کرنے سے قبل ان کے مدافعتی نظام کا جائزہ لے کر وہیں سے ہی ایسے سفید خلیے حاصل کیے، جو کینسر زدہ خلیات پر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ماہرین نے مریضہ کے جسم سے حاصل کیے گئے سفید خلیوں کی لیبارٹری میں افزائش کرنے کے بعد اسے واپس مریضہ کے جسم میں ڈال دیا، جنہوں نے ابتدائی ہفتے میں کینسر کے خلاف جنگ شروع کر دی اور متاثرہ خاتون کی حالت بہتر ہونے لگی۔ 52 سالہ جوڈی پارکنس کے جگر میں رسولی سمیت جسم کے دیگر حصوں میں بھی کینسر تھا اور وہ اس کی آخری اسٹیج پر تھیں۔ ڈاکٹرز نے جوڈی پارکنس کو زندہ رہنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تین ماہ کا وقت بتایا تھا، تاہم آخری ہفتوں میں ہونے والے ان کے علاج نے انھیں زندگی بخش دی۔ جوڈی پارکنس کی تھراپی 2015 کے آخر میں کی گئی اور اب ان کا کینسر ختم ہو چکا ہے۔ ماہرین کے مطابق جوڈی پارکنس کی کی گئی غیر معمولی تھراپی کا تجربہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، تاہم ابتدائی تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے ہر طرح کے کینسر کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا۔ ہندوستان میں بریسٹ کینسر ابھی ترقی یافتہ دنیا کے مقابلے میں کم ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب مرض بڑھ چکا ہو اور اس لیے علاج مشکل ہو جاتا ہے۔

Ansari Tarannum Bano Zubair Ahmad
Raat Rani Chowk, Near Masjid Masood
Firdaus Nagar, Dhualia-424001 (M.S)

ایلوویرا قدرت کا ایک انمول تحفہ

ایلوویرا ایک قدرتی جڑی بوٹی ہے، جو اپنے اندر بے پناہ تاثیر اور فوائد چھپائے ہوئے ہے۔ یہ حسن و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ میڈیکلی بھی استعمال ہو رہی ہے۔ یہ ایسا پودا ہے جسے آسانی سے گھر میں اگایا جا سکتا ہے۔

ایلوویرا کی تاریخ: ایلوویرا کی تاریخ چار ہزار سال پرانی ہے۔ اس کی دستاویز جو ہمیں ملتی ہے وہ نیپال کے مٹی کے بورڈ پر لکھی ہوئی ملتی ہے جو کہ 2200 قبل مسیح پرانی ہے۔ اس دور کے لوگ اس کے فوائد سے آگاہ تھے اور اسے مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال کرتے تھے۔

ایلوویرا جوس کا حوالہ قدیم مصری تحریروں میں بھی ملتا ہے جو کہ چھ ہزار سال پرانی ہیں۔ قلوپطرا اپنے حسن کے نکھار کے لیے ایلوویرا اپنی معمول کی زندگی میں استعمال کرتی تھی۔ الیگزینڈر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جنگوں میں زخموں کی مرہم کاری کے طور پر ایلوویرا جوس کا استعمال کرتا تھا۔ کولمبس کرسٹوفر بھی ایلوویرا کے پودے کو مرہم کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اپنے ساتھ بحری جہاز میں ہمیشہ ایک پودا لگائے رکھتا تھا۔

قدیم سنسکرت میں ایلوویرا کو گھریتا کماری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ عورت کی خوبصورتی اور حسن کے زیبائش کے لیے ایلوویرا سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں۔ اور مختلف نسوانی بیماریوں کے علاج میں بھی اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ چین کی ثقافت میں ایلوویرا کو مختلف دوائیوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ الغرض زمانہ قدیم سے ہی ایلوویرا کی اہمیت مسلم ہے کہ یہ نہایت مفید جڑی بوٹی ہے۔

اقسام: ایلوویرا کی پانچ سو کے قریب اقسام ہیں اور یہ للی کی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا آبائی وطن افریقہ ہے۔ یہ گرم علاقوں میں آسانی سے اگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ، جنوبی افریقہ، چین، پاکستان وغیرہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

ایلوویرا میں موجود اجزا: اس میں پانی، 20 معدنیات، 12 وٹامنز، اور 200 فوٹو نیوٹرنز ہوتے ہیں۔

وٹامنز: بی ون، بی ٹو، بی تھری، بی فائیو، بی سکس، بی ٹویلو، سی ای، فولک ایسڈ، کولائن۔ **معدنیات:** کیلشیئم، کرومیم، کوپر، آوڈین، آئرن، میگنیشیم، میگانیز، میلوبیڈینم، سلینیئم، سیلکون، سوڈیم کلورائیڈ، سلفر، پوٹاشیم، فاسفورس، زنک۔

امائنو ایسڈ: اس میں بیس قسم کے امائنو ایسڈ پائے جاتے ہیں۔ جو کہ ہمارا جسم خود نہیں بناتا۔

فوائد: ایلوویرا جسم کے مدافعتی نظام کو بہتر اور مضبوط بناتا ہے۔ بیکٹیریا کو ختم کرتا ہے اور بڑھاپے کے اثرات کو کم کرتا ہے۔ سفید سیلز کو تیز کرتا ہے۔ کینسر سے بچاتا اور دل کو مضبوط کرتا ہے۔ بلڈ شوگر کے لئے بھی مفید ٹانک ہے۔ جوڑوں، مسلز، ٹیشوز اور مسوڑوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کا استعمال ایڈز کے مریضوں میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔

جلد اور بالوں کی خوبصورتی کے لئے صدیوں سے آزمودہ ٹانک ہے۔ الغرض اس کے بے شمار اندرونی اور بیرونی فوائد ہیں۔ اطباء اور جدید طبی ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جراثیم کش اجزاء کی بدولت اگر جل جانے والی جگہ یا جلد کی خارش پر ایلوویرا لگایا جائے تو جل جانے والی جگہ پر آبلہ نہیں پڑتا اور اسی طرح جلد کی خارش کو دور کرتا ہے۔ چہرے کے کیل مہاسوں پر روزانہ چند ہفتوں تک اس کا گودا نکال کر لگایا جائے تو کچھ ہی عرصے میں کیل، مہاسے ختم ہو جاتے ہیں۔ چہرہ خوبصورت اور جلد صاف و شفاف ہو جائے گی۔ گودا لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ پودے سے تھوڑا سا ایلو

ویرا کا پتہ توڑ لیں اور گودا چہرے پر لگا کر آدھا گھنٹہ بعد منہ دھولیں۔ آج کل رنگت نکھارنے والی کریموں، صابن، شیمپو اور شیونگ کریم وغیرہ میں اس کا استعمال عام ہے۔ آپ گھر میں ایک پودا گھیکوار کا رکھیں اور فائدہ اٹھائیں۔

چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے ہفتے میں دو بار گھیکوار کے رس میں تھوڑا سا روغن زیتون اور روغن بادام ملا کر چہرے پر لیپ کریں اور دو گھنٹے بعد چہرہ دھولیں مستقل کچھ عرصے تک یہ عمل کریں جلد صاف شفاف اور چمکدار ہو جائے گی۔ غسل سے آدھ گھنٹہ قبل گھیکوار کا رس بالوں میں

لگائیں تو اس سے خشکی اور سر کی جلد پر ہوجانے والے دانے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بال مضبوط اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔

اگر کوئی زہریلا کیڑا کاٹ لے تو گھیکوار کے پتے کو کاٹ کر گودے والی جگہ سے متاثرہ حصے پر باندھ لیا جائے تو زہر کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور جلد سوزش سے محفوظ رہتی ہے اور زخم بھی نہیں ہوتا۔

ہاتھوں کے کھردرے پن اور سختی کو دور کرنے کے لیے اور ملائم و خوبصورت کرنے کے لیے یہ طریقہ آزمائیں۔ آدھا کپ گندم کا چوکر لیں اور اس میں ایک کھانے کا چمچ گھیکوار کا عرق شامل کرکے بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کرلیں اور اس آمیزے کو تین منٹ تک ہاتھوں پر مساج کریں اور پھر ہاتھوں کو نیم گرم پانی سے دھولیں یہ عمل رات کو سوتے وقت کریں تو بہتر رہے گا کیونکہ اس کے بعد آپ پانی میں ہاتھ نہ ڈالیں اگر آپ بھی بدرونق ہاتھوں کی وجہ سے پریشان ہیں تو یہ نسخہ استعمال کریں چند روز میں ہاتھ ملائم اور خوبصورت ہو جائیں گے۔

ایلوویرا زمانہ قدیم سے جدید تک کئی امراض میں قدرتی آفاقی شفا بخش عامل کے طور پر مختلف بیماریوں کے علاج میں شفایابی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے خاص کر السر اور السر کے زخموں کو مندمل کرنے کی اسکی مخفی شفایابی قوتوں کو تحقیق شناسی میں السر کے سوراخوں اور زخموں کو مندمل اور تندرست کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے یہ ان السروں میں "منہ کا السر، حلق کا السر، غذائی نالی کا السر، معدہ کا السر، معدہ میں زخم، چھوٹی آنت کا السر، بڑی آنت کا السر، گیسٹرک السر اور کینسر، پیپٹیک السر اور کینسر، سیدھی آنت کا السر، مقعد کا السر، ورم قولون، شگاف مقعدہ یومیو پیتھک علاج میں سب سے پہلے 1864 میں کانسٹلائن ایلوویرا کو بطور دوا ثابت کیا تھا۔

نقصانات: ایلوویرا کو کھانے کے طور پر استعمال کے کچھ نقصانات سامنے آئے ہیں وہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کا استعمال زیادہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ کچھ بیماریوں میں بھی اس کا استعمال نقصان دہ ہے۔

کچھ لوگوں کو ایلوویرا کھانے سے الرجی ہو جاتی ہے۔ چہرے کی سوزش اور سرخ ہونا، سانس کی تکلیف اور دم گھٹنا وغیرہ جن لوگوں کو ایلوویرا کھانے سے ایسی علامات سامنے آئیں وہ فوری طور پر ڈاکٹر سے رجوع کریں اور ایلوویرا کا استعمال بند کردیں۔

ڈائریا اور پیٹ کی تکلیف، شدید قسم کی قبض بھی ایلوویرا کے زیادہ استعمال سے سامنے آئی ہے۔

اس کے علاوہ جن لوگوں کو خونی بواسیر اور تھائرائڈ کا مسئلہ ہے وہ بھی ایلوویرا سے پرہیز کریں، ایلوویرا کے مسلسل استعمال سے پیشاب سرخ ہونے لگتا ہے اور ڈی ہاڈریشن کا مسئلہ بھی سامنے آیا ہے۔ ایلوویرا کو انجکشن کی صورت میں لگوانا سخت نقصان دہ ہے۔ اس کے علاوہ حاملہ عورتیں بھی حمل کے دوران اس سے پرہیز کریں۔ مجموعی طور پر ایلوویرا ایک مفید پودا ہے۔۔۔ مگر کچھ صورتوں میں یا کچھ مریضوں کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' مئی 2018ءبدست ہوا۔ اس کے حسن و جمال میں تو روز افزوں اضافہ ہوتا ہی جارہا ہے۔ رنگ ونور کی یہ گلکاری اس لیے بھی نہایت دلکش نظر آرہی ہے کہ اس میں راقم الحروف کی تحریر کردہ کہانی بعنوان ''ان بن'' شامل ہے جس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس شمارہ کی شروعات ان ذہین لڑکیوں کی روداد سے کی گئی ہے جنھوں نے ہندوستان کے اعلیٰ ترین امتحانوں میں کامیابیوں کے پرچم لہرادیے ہیں اور یہ ثابت کردیا ہے کہ اگر وہ محنت پر اُتر آئیں تو کسی بھی امتحان میں کامیاب وکامران ہوسکتی ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو میں امتحانوں کی تیاری کے نادر طریقے بتائے گئے ہیں۔ بشمول اس کے کہ اسٹڈی کے لیے روزانہ کتنے گھنٹے دیے جائیں۔ اس میں ایک خاطر خواہ اضافہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امیدوار اپنی سطح ذہانت (I.Q.) کے مطابق مجوزہ وقت میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ''خواتین دنیا'' کے تمام تر مشمولات نہ صرف افادیت سے معمور ہیں، بلکہ یہ مجلّہ خواتین کی آل راؤنڈ ڈیولپمنٹ میں بھی گہری دلچسپی ونظر رکھتا ہے۔ ایسی شاندار پیش کش پر آپ تمام کو پر خلوص مبارکباد قبول فرمائیں۔

مصطفٰی ندیم خان غوری، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ ماشاءاللہ خوب سے خوب تر کا سفر جاری ہے۔ پہلی نظر میں اس رسالہ نے من موہ لیا۔ سرورق تا آخر تمام صفحات بہت ہی جاذب نظر اور دیدہ زیب ہیں ایک ہی نشست میں پورا رسالہ مطالعہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ مکالمہ کے ذریعہ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ قومی اردو کونسل نے نوری نستعلیق میں اردو کے پہلے ای۔ بپ کا اجرا کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو نے ہر دور میں ہر طرح کے چیلنجز کا سامنا کیا ہے اور ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کسی ترقی یافتہ زبان سے کم نہیں۔

چھایا گانگولی سے صدر عالم گوہر کی گفتگو بہت ہی دلچسپ، سبق آموز اور حوصلہ افزا ہے۔ ہندوستان کی پہلی معلمہ کی زندگی کا سفر میں فیاض صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں ہندوستانی خاتون کی صبر وتحمل، ایثار و قربانی اور خدمت خلق کے جذبہ کو بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے ہندوستانی خاتون بھی مردوں سے کم نہیں بڑی سے بڑی مشکل اور ناسازگار ماحول بھی اسے اس کے مقصد کے حصول سے نہیں بھٹکا سکتے۔

ہندوستانی تصور تانیثیت میں بھی ہمارے سماج اور ہمارے ملک میں خواتین کس طرح سوچتی ہیں، کس طرح رہتی ہیں اور سماج نے انھیں کیا مقام عطا کیا ہے۔ سبھی تصاویر نظروں میں گھوم جاتی ہیں۔ قانون میں خواتین کے تحت جو تحریریں آپ شائع کررہے ہیں وہ بہت ہی کارآمد ہیں آج کے ماحول میں تمام خواتین کو یہ معلومات ہونی چاہیے ان مضامین کی مکرر اشاعت بھی سودمند رہے گی۔

ٹوٹ گیا اک تارہ، تسنیم سلیم چھتاری کی کہانی لمحے اور خواہشات کہانیاں بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ حسن سخن میں رونق دہلوی، تحسین کاظمی و پروین شیر کی تخلیقات معیاری ہیں رسالہ کی پابندی سے اشاعت پر کونسل کے سبھی اراکین کو بہت بہت مبارک باد۔

شرفا تابش، اورنگ آباد، جھارکھنڈ

ماہ جون خواتین دنیا کا پہلی بار دیدار ہوا۔ اس کی طباعت، سرورق، مختلف رنگوں کا استعمال، عمدہ کاغذ اور بہترین بائنڈنگ کسی بھی انٹرنیشنل میگزین سے کم نہیں۔ میں نے رسالہ پہلی بار دیکھا اس لیے مبارک باد دینا بھی میرا فرض ہے۔

مکالمہ بہت ہی عمدہ اور معلوماتی ہے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے ادارہ نے اردو میں پہلے ای اپ کا اجراء کیا جس سے اردو قارئین مستفید بھی ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بڑا کام ہے جس کے لیے آپ کے ادارہ کو بہت بہت مبارک باد۔

'چھایا گانگولی سے گفتگو' ہندوستان کی پہلی معلمہ، ہندوستانی تصور تانیثیت، ٹوٹ گیا ایک تارہ، میراث، لمحے اور خواہشات، قانون میں خواتین، غزلیات، منظومات سبھی مواد اور موضوع کے اعتبار سے معیاری اور معلوماتی ہیں، باورچی خانہ، صحت، آرائش و زیبائش بھی دلچسپ ہیں۔ نوجوان خواتین کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ خدا کرے 'خواتین دنیا' کا سفر پورے آب و تاب سے جاری رہے۔

رعنا عندلیب، بیجن پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان ماہنامہ خواتین دنیا میرے سامنے ہے آپ نے یہ رسالہ ایسے وقت میں جاری کیا جب خواتین کے چاروں طرف بڑے بڑے مسائل ہیں ان مسائل کے حل کی تلاش میں ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ہماری مدد کرے گا۔ مدیر صاحب کو میری طرف سے اس نیک کام کے لیے مبارک باد۔

صدر عالم گوہر نے چھایا گانگولی کے پورے سفر کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے جو کافی حوصلہ مند ہے۔ ہندوستان کی پہلی معلمہ کی زندگی سے بھی ہمیں ناسازگار حالات میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا درس ملتا ہے۔ ایسی خواتین کے حالات زندگی کو زیادہ سے زیادہ پیش کیا جائے تاکہ نوجوان خواتین کو حوصلہ ملے۔ رسالہ میں نوجوان خواتین کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ ایسی خواتین جنھوں نے سماج و دیگر شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے ان کی زندگی کا سفر اور پیش آنے والے اہم واقعات کو نمایاں طور سے رسالہ میں پیش کیا جائے تاکہ نوجوان خواتین ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں اور مقاصد کے حصول کے راستے میں آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں سے دل برداشتہ نہ ہوں۔

فلک ناز، محلہ کریم گنج، نزد سنہری مسجد، بھوپال

ماہ جون کا 'خواتین دنیا' میرے سامنے ہے۔ یہ ماہنامہ اپنی گوناگوں صفات کے سبب بہت جلد قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اس بار چھایا گانگولی کا انٹرویو یوں تو کافی معلومات افزا لگا لیکن جناب صدر عالم صاحب نے صرف غزل گائیکی تک چھایا جی کو محدود کر کے رکھ دیا البتہ چھایا جی کی اردو دوستی کے بعض گوشے بالکل نئے اور متاثر کن تھے۔ گزارش تھی کہ انٹرویو کے آغاز میں غزل گائیکی کی مختصر تاریخ اگر لکھ دی جاتی تو قارئین کے لیے یہ انٹرویو دستاویزی حیثیت کا حامل بن جاتا۔ چھایا جی بنیادی طور پر خیال گائیکی سے وابستہ رہیں لیکن طلعت محمود اور بیگم اختر کی غزل گائیکی نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اسی کی ہو کر رہ گئیں گو کہ انھوں نے ٹھمری اور دادرا بھی خوب گایا ہے لیکن غزل میں انھوں نے الگ شناخت قائم کی۔ غزل گائیکی کے لیے انھوں نے جی توڑ محنت کی، اردو زبان پر دسترس حاصل کی، بہت سے راگوں پر خاص ریاضت سے اپنے سانچے میں ڈھالا۔ اپنے دور کے بڑے استادوں سے اکتساب واستفادہ کیا جس کی بدولت ان کے فن میں نکھار پیدا ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ اردو والوں نے ایسے فنکاروں کی طرف کبھی توجہ کرنے کی زحمت نہیں کی۔ خوشی ہوئی کہ خواتین دنیا کے وسیع القلب شعبۂ ادارت نے جناب صدر عالم گوہر کے انٹرویو کو اہمیت کے ساتھ شائع کیا میری طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

رواں مہینے کے ماہنامے میں اور بھی کئی مضامین و تخلیقات اہمیت کی حامل ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ان پر رائے زنی نہیں کر رہی ہوں۔ میری طرف سے ایک بار پھر قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف کو مبارک باد۔

نازنین آفرین، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کوششوں سے جاری ماہنامہ خواتین دنیا اپنی نوعیت کا الگ اور اردو کا سب سے منفرد ماہنامہ ہے جس میں عموماً خواتین کے لیے نہایت کارآمد مواد ہوتا ہے۔ ادب، ثقافت سے لے کر امور خانہ داری تک جو بھی مواد ہوتا ہے وہ دیگر رسائل سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ اس بار نوریہ پروین کے ذریعہ لکھا گیا اقبال اور قرۃ العین حیدر کی فکری مماثلت سے متعلق مضمون کافی عرق ریزی کا غماز ہے۔ یہ نوریہ کی اپنی ادبی بصارت اور تحقیقی مہارت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اچھی کوشش کی ہے اللہ ان کے جوش و جذبے کو مزید تقویت عطا فرمائے۔ پروفیسر شاہدہ شاہین کی 'میراث'، زیب النساء دیا کی کہانیاں بھی دل کو چھو لینے والی ہیں۔ مستقل کالم بھی پہلے سے زیادہ نکھرے اور سنورنے لگے۔ آپ لوگوں کی محنت خواتین دنیا میں نئے گلستان آباد کر رہی ہے۔ اللہ آپ کی سعی جمیل کو قبول فرمائے۔

کوثر ریحانہ، سلطان پور، یوپی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فرہنگ ادبیات

مصنف: سلیم شہزاد
صفحات: 831
قیمت: 345 روپے

پیکر فکر و عمل: سید حامد

مرتب: سید منصور آغا
صفحات: 454
قیمت: 210 روپے

کلیات فراق (غزلیات) جلد اوّل و دوم

مرتب: جعفر رضا
صفحات: 556 (اوّل) 576 (دوم)
قیمت: (سیٹ) 520 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابر احسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

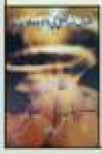

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت 185 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دویندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

انتخاب سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل و دوم)

مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

عروج فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

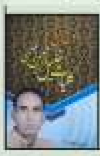

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

صرف تمہارے لیے

مصنف: ڈاکٹر ستیندر ناڈاگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

کلیات بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات: 383
قیمت: 180 روپے

شاعری کی تنقید

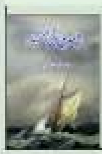

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

انتخاب سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2018, Vol. 02, Issue: 7
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گئے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

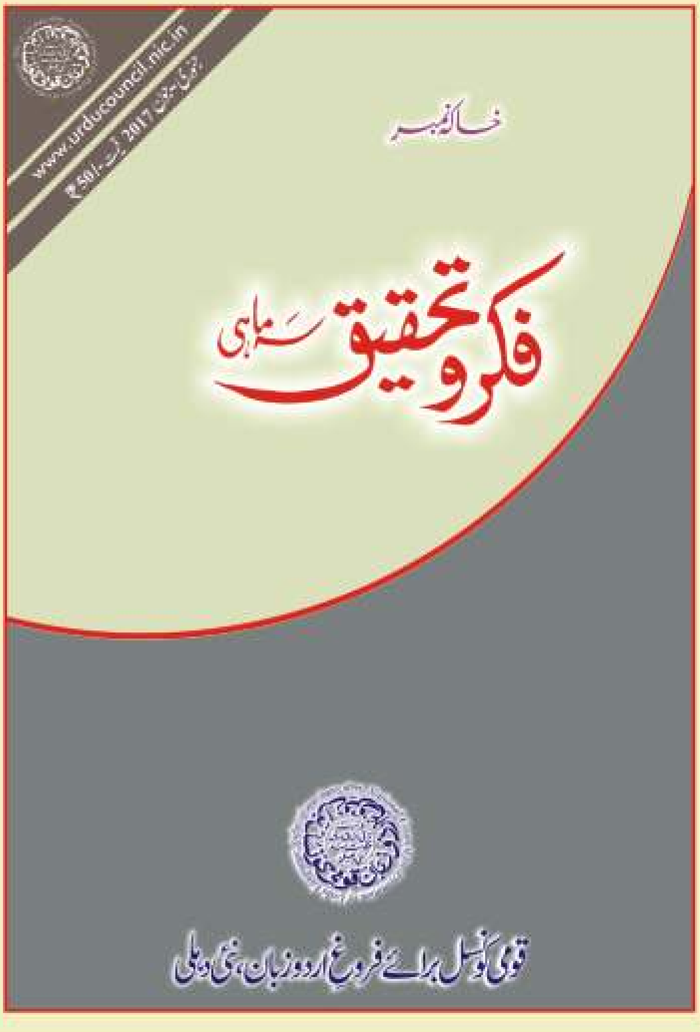

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025